مجھے اپنا نام و نشاں ملے







کومل ذیشان

پاکسوسائٹی ڈاٹ کام

مجھے اپنا نام و نشاں ملے

کومل ذیشان

جسم سے زندگی کی حرارت ختم ہوتے ہی اس کا چہرہ کاغذ کی طرح سفید ہوا تھا۔وہاں موجود دونوں نرسوں نے جو پچھلے پانچ دن سے اس کمرے میں شام کی ڈیوٹی پر تھیں ایک دوسرے کو آزردگی سے دیکھا۔کمرے میں چھائی گہری چپ میں صرف سکرین پر چلتی سیدھی سبز لکیر کی مدھم گونج تھی۔

"ان کی ڈرپ ریموو کریں۔"ڈاکٹر نے گہری سانس لیتے ہوئے دونوں کو ہدایت جاری کی اور باہر کی طرف قدم بڑھائے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

دیوار پر آویزاں بھیڑیے کی جہازی سائز پورٹریٹ کو صبح کی زرد افشاں جیسی روشنی بگھوتی جارہی تھی،سامنے لگی سیاہ گھڑی کا ہلتا پینڈولم آٹھ بجنے کا اعلان کر رہا تھا۔دفتر میں موجود ہر چیز کرسی،میز،قالین،صوفہ سیاہ رنگ کے تھے سوائے اس سرمئی پتھر کے مجسمے کے جو ہاتھ اٹھائے پھٹی پھٹی آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔دیپک نے کھڑکیوں کے پٹ کھول کر خزاں کی خوشبو میں ڈوبی ہوا کو اندر آنے کا راستہ دیا اور پھر گنگناتے ہوئے جھاڑ پونچھ کرنے لگا۔

ہری ہری کائی پر پاؤں پڑا تو پھسلے گا۔۔۔

میز پر کپڑا پھیر کر اس نے ترتیب شدہ فائلوں کو ایک بار پھر ترتیب سے رکھا۔

آ چل دن کو روکیں،دھوپ کے پیچھے دوڑیں۔۔۔

ایش ٹرے کو اچھی طرح جانچا۔

چھاؤں چھوئے نہ۔۔۔

یونہی گنگناتے ہوئے کمپیوٹر کی سکرین کو اچھے طریقے سے صاف کر کے پاس پڑے فوٹو فریم کا معائینہ کیا۔اس فریم میں بھارت کے مشہور بیوپاری رفیق احمد کی تصویر تھی ان کی وفات ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی ہوئی تھی۔دیپک کو یہاں اس آفس میں کام کرتے تقریباً پندرہ برس بیت چکے تھے وہ آکاش کی اپنے باپ کے ساتھ دلی وابستگی سے اچھی طرح آگاہ تھا،وہ پچھلا کچھ عرصہ جس تکلیف دہ دور سے گزرا تھا اس سے بھی بلکہ پچھلے کچھ عرصے میں وہ اس کے اتنے قریب آگیا تھا کہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس فوٹو فریم میں رفیق احمد کی تصویر کے نیچے ایک اور تصویر ہے جسے آکاش اکثر نکال کر تکتا رہتا ہے۔

او ساتھی رے۔۔۔وہ ابھی گنگنانے میں ہی مصروف تھا کہ دروازہ کھلا۔

"ہیلو ڈیئر۔" آکاش اندر داخل ہوا۔

"نمستے سر۔" دیپک نے دھیمے سے مسکرا کر اسے خوش آمدید کہا۔

آکاش نے حسب معمول صبح ہی صبح سگریٹ سلگا کر کمپیوٹر آن کیا۔

"تمہارا بیٹا کیسا ہے اب؟"

"جی سر اب تو بھگوان کی کرپا سے ٹھیک ہے۔"

"گڈ۔" وہ انٹرنیٹ کنیکٹ کرتے ہوئے بولا۔ دیپک کے بیٹے کو پچھلے دنوں ہیضہ ہوا تھا۔

کمپیوٹر کی سکرین پر نیو یارک ٹائمز کی ہیڈ لائینز جگمگا رہی تھیں۔ دیپک نے جلدی سے مختلف اخباروں کے آج کے شمارے آکاش کے سامنے لا کر رکھے۔

"پاکستان کی مشہور صحافی اور سوشل ایکٹیوسٹ (سماجی کارکن) کنزہ وسیم پچھلے پانچ دن سے ہسپتال میں زیر علاج تھیں۔۔۔" خبر پڑھتے ہوئے آکاش کی نگاہ دھندلائی تھی۔

"رپورٹ کے مطابق ان پر ان کے آفس کے باہر ہی فائر کیا گیا۔" اس نے بے چینی سے ماتھا مسلا۔

"شاید کوئی اور۔۔۔ شاید نام کی غلط فہمی۔۔۔" اس نے کانپتے ہاتھوں سے نیچے کی طرف سکرول کیا۔

"ان کے جسم میں پانچ گولیاں پیوست ہوئیں۔ ان پر حملے کی بڑی وجہ پچھلے کچھ سالوں میں اقلیتوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھانا ہے۔" اب اسے اپنے دل کی دھڑکن کانوں میں سنائی دے رہی تھی۔ دیپک اسکی حالت سے بے خبر صفائی میں مصروف تھا۔

"وہ کچھ سال اقوام متحدہ کے ادارے UNHCR (اقوام متحدہ کا پناہ گزینوں کے لیئے بنایا گیا ادارہ) سے بھی وابسطہ۔۔۔" وہ جھٹکے سے کھڑا ہوا دیپک نے حیرانی سے اس کے سرخ چہرے کی طرف دیکھا۔ اس سے پہلے کے وہ اس سے کوئی سوال کرتا وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

"ورون۔" اس نے سیکرٹری کو پکارا۔

"جی سر۔" وہ مودب سا کھڑا ہو گیا۔

"میرا چائینہ کے وزیر کے ساتھ جو انٹرویو فکس (طے) ہے اس میں میری جگہ کسی اور کو فٹ کرو۔" اس نے اپنے ہاتھوں اور لہجے کی لرزش پر بمشکل قابو پاتے ہوئے کہا۔

"مگر سر وہ انتہائی اہمیت۔۔۔"

"اور میری کراچی کی ٹکٹ بک کرواؤ۔۔۔ ایمرجینسی۔" ورون کی بات کاٹتے ہوئے وہ بلند آواز میں بولا تھا۔

"Sir, is everything all right(کیا سب کچھ ٹھیک ہے سر)ورون اسکے روّیے سے تھوڑا پریشان ہوا۔

"Yes, sure(ہاں، بالکل) میں آفس میںwait(انتظار) کر رہا ہوں۔" وہ کہتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ورون کمپیوٹر کی طرف مڑا۔

جب وہ صرف دس سال کا تھا تو اس کی ماں کینسر سے مر گئی تھی وہ اپنی ماں کا جلتا وجود آج تک نہیں بھولا تھا۔اس کا بڑا بھائی جلد سنبھل گیا تھا مگر وہ دن رات کونے میں منہ چھپائے روتا رہتا تھا پھر بابا نے ایک دن اسے اپنے پاس بٹھایا۔

"تم جانتے ہو اس دنیا میں کتنے ہی لوگ ہیں جنہیں تم سے کہیں زیادہ برے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر پھر بھی وہ جیتے ہیں۔۔۔نہ صرف خود جیتے ہیں بلکہ اپنے ساتھ جڑے اور لوگوں کو بھی زندہ رکھتے ہیں۔اتنی تکلیفوں کے باوجود کمانے کے لیے باہر نکلتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں۔۔۔ مسکراتے ہیں۔ تمہیں بھی ان کی طرح بہادر بننا ہے۔زندگی کو صحیح طریقے سے جینا ہے اس کے باوجود کہ موت بعض اوقات بہت پیاری اور دل کے قریب چیزوں کو ہم سے چھین لے جاتی ہے۔" مگر آج اسے ذہن پر زور ڈالنے کے باوجود بابا کی یہ بات یاد نہیں آ رہی تھی جو وہ روز بلا ناغہ دہرایا کرتا تھا۔

"آخری دفعہ میری اس سے کب بات ہوئی ہے۔" اس نے سوچنے کی کوشش کی۔

"شاید دو سال پہلے۔۔۔بابا کی موت کے ایک مہینے بعد۔" اس نے گاڑی ائرپورٹ کی طرف دوڑاتے ہوئے یاداشت پر زور ڈالا۔

"کیا کہا تھا اس نے مجھے۔۔۔ آخری بات کیا کہی تھی۔۔۔" ذہن پر زور ڈالنے کے باوجود وہ یاد نہیں کر پا رہا تھا۔

"نہیں۔۔۔اس کے ایک مہینے بعد میری اس سے دوبارہ بات ہوئی تھی۔" آنکھوں کو بری طرح مسّلتے اس نے اپنی تصحیح کی۔

"جب روکنے کے لیے فون کیا تھا میں نے۔۔۔ہاں روکا تھا اسے میں نے۔۔۔" وہ دائیں بائیں سر ہلاتا اضطراب میں بڑبڑایا۔

پچھلے کچھ عرصے سے تو اس کی یاد بھی روٹھی ہوئی تھی۔مصروفیت اتنی تھی نئے ناول کا لانچ، انٹرویوز، فیچرز کی تیاری۔کل رات ٹائمز آف انڈیا کی سٹاف کو دی گئی پارٹی میں وہ ہاتھ میں شراب کا گلاس پکڑے کسی صحافی سے محو گفتگو تھا تو چند نو عمر لڑکے لڑکیوں نے اسے گھیر لیا۔

"سر ہم آپ کو ہمیشہ سے آئیڈلائز کرتے آئے ہیں۔ in fact(درحقیقت) یہاں جاب کرنے کا مقصد بھی آپ کےunder(ماتحت)کام کرنا ہے۔" وہ جواباً مسکرایا تھا۔اتنے سالوں میں ایسے جملے سننے کی عادت ہو گئی تھی اسے۔

"سر برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔" ان میں موجود ایک نو عمر لڑکی شرارتی انداز میں بولی تھی۔

"آپ کی تحریریں پڑھ کر لگتا نہیں ہے کہ آپ شراب بھی پی سکتے ہیں۔" اس نے جواب میں قہقہ لگایا تھا اور بڑے دنوں بعد

اس کی یاد نے دل پر پھر سے دستک دی تھی۔

وہ سٹال پر کھڑا شراب چکھ رہا تھا اس کا دوست ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ یہ فوڈ فیسٹیول دہلی میں بڑے پیمانے پر جواہر لال نہرو سٹیڈیم میں منعقد کیا گیا تھا۔ اس کی کلاس کے تقریباً سبھی طلبا وہاں موجود تھے وہاں آئے سبھی لوگ خوب لطف اٹھا رہے تھے۔ اسی دوران کنزہ وسیم خاص طور پر چلتی ہوئی اس تک آئی تھی۔

"کل رات آپکا آرٹیکل پڑھا، Drugs Addiction and our Generation (نشے کی عادت اور ہماری نسل) اس آرٹیکل کو پڑھنے کے بعد لگتا نہیں ہے کہ آپ خود کسی ایسی چیز کو چھو بھی سکتے ہیں۔" اس نے اسکے گلاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اسے جو اس کے پہلے جملے پر خوشگوار سا احساس ہوا تھا دوسرے جملے پر بھک سے اڑ گیا۔

"دوسروں کی اصلاح خاصا آسان کام ہوتا ہے مس کنزہ جبکہ خود پہ اپلائی کرنا خاصا مشکل۔" اس نے ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یعنی آپ اپنی کمزوری کا اعتراف کر رہے ہیں۔"

"ایسا ہی سمجھ لیجیے۔"

"قران میں ایک Chapter (سورۃ) ہے The Poets (الشعرا) اس میں لکھا ہے:

"Art thou not aware that they roam confusedly through all the valleys and that they say what they do not do-"

(کیا تو نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی (خیال) میں (یونہی) سرگرداں پھرتے رہتے ہیں اور یہ کہ وہ (ایسی باتیں) کہتے ہیں جنہیں (خود) کرتے نہیں ہیں۔)

"ویسے مان لیجیے آپ اپنے دین کی تبلیغ کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"میں صحیح بات صحیح وقت پر کہنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔۔۔ اصل میں۔" وہ دل جلا دینے والے انداز میں مسکراتی آگے بڑھ گئی جبکہ اس کے ابرو تن گئے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

ابھی فلائیٹ میں اچھا خاصا وقت تھا۔ وہ وہاں کرسی پر قدرے غیر آرام دہ حالت میں بیٹھا فلائیٹ کا انتظار کر رہا تھا۔ گاڑی وہ ائیرپورٹ کی پارکنگ میں چھوڑ آیا تھا کوئی بھی اسے غور سے دیکھتا تو آسانی سے جان لیتا کہ وہ رو رہا ہے۔ چہرہ جھکائے وہ جوتے کی نوک سے فرش پر نامعلوم نشان مٹانے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ وہ جانتا تھا یہ نشان وہاں فرش پر نہیں اس کے دل پر ہیں۔

پہلا پیریڈ Global media and politics (عالمی صحافت اور سیاست) تھا۔ اس نے کلاس میں داخل ہونے سے پہلے ببل گم منہ سے نکال کر باہر ڈسٹ بن میں پھینکی اور اندر داخل ہوا۔ پروفیسر آ چکے تھے اور چونکہ یہ نئے سال کی پہلی کلاس تھی تو وہ سب کا تعارف لے رہے تھے۔

"میرا نام کنزہ وسیم ہے۔" کرسی پر بیٹھتے ہوئے اسے کوئل کی کوک سنائی دی تھی۔

"غالباً آپ پاکستانی سفیر مسٹر وسیم بنگش کی بیٹی ہیں؟"

"جی سر۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

Welcome, welcome here (خوش آمدید خوش آمدید یہاں پر) ہم امید کرتے ہیں آپ یہاں سے خوب گیان اور اچھی یادیں لیکر جائیں گی۔" آکاش نے مڑ کر اسے دیکھا روشن دان سے آتی سنہری کرن اسکے ڈیسک پر پڑ رہی تھی جس سے اس کا چہرہ مدھم مدھم سا دوپٹے کے ہالے میں دمک رہا تھا۔

"تھینک یو سر۔" وہ کہتے ہوئے واپس بیٹھ گئی تھی۔

آکاش نے دو سال پہلے اسی یونیورسٹی سے ایم بی اے کیا تھا مگر کوشش کے باوجود بڑے بھائی کی طرح وہ بزنس میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹانے میں بری طرح ناکام رہا تھا چار و ناچار رفیق احمد نے اسے اپنی مرضی کا پیشہ اختیار کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ اس نے اپنے لیے صحافت کا شعبہ چنا تھا اور دوبارہ اسی یونیورسٹی میں ایم اے جرنلزم میں داخلہ لے لیا تھا۔ وہ رفیق احمد کی سفارش کی وجہ سے ایک مشہور اخبار سے بھی منسلک ہو گیا تھا جس میں اسکے کالمز اور آرٹیکلز وقتاً فوقتاً چھپتے رہتے تھے۔ اخبار میں لکھنے کے باعث وہ ایک خاص حلقے میں جانا جانے لگا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

"سر۔" اس نے چونک کر سامنے دیکھا ایک نوعمر لڑکا اس کو پکار رہا تھا وہ ابھی بھی اسی نا سمجھی کی کیفیت میں تھا۔

"سر میں آپ کا بہت بڑا فین ہوں سر۔۔۔" اس لڑکے کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

"میں آپ کی ہر تحریر پڑھتا ہوں۔۔۔ بلکہ میں نے آپ کی لکھی مووی بھی سینما جا کر دیکھی ہے۔۔۔ پورے تین بار۔" وہ اس کی کیفیت سے بے خبر اسے داد طلب نظروں سے دیکھتے کہہ رہا تھا۔ آکاش اتنی دیر میں خود کو تھوڑا کمپوز کر چکا تھا۔

"سر میں نے حال ہی میں انٹر کیا ہے اب میں آگے کیا کروں، میں بھی آپ کی طرح۔۔۔" اس نے سننے کی کوشش کی مگر اس لڑکے کے سارے لفظ آپس میں مدغم ہو گئے تھے۔ اس نے بے چارگی سے اس مسلسل بولتے ہوئے بچے کی طرف دیکھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ بڑی خندہ پیشانی سے اس سے گفتگو کرتا مگر اس وقت مسئلہ یہ تھا کہ اس کو اسکے ہونٹ تو ہلتے دکھائی دے

رہے تھے مگر کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ اچانک جھٹکے سے اٹھا اور سموکنگ ایریا کی طرف بڑھ گیا جبکہ وہ لڑکا سرخ چہرہ لیے وہاں سے چلا گیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مڈٹرم کے امتحانات ابھی ابھی ختم ہوئے تھے کلاس میں سب تاج محل جانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ ان سب میں سب سے زیادہ پرجوش کنزہ تھی۔ آکاش نے سامنے ڈیسک پر بیٹھی کنزہ کے خوشی اور شوق سے دمکتے چہرے سے نگاہ ہٹا کر کھڑکی سے نظر آتیں برگد کی اداس شاخوں کو دیکھا اور ڈیسک پر بکھرے نوٹس سمیٹنے لگا۔ گو اس کو وہاں جانے میں ذرا بھی دلچسپی نہیں تھی سینکڑوں بار کا دیکھا ہوا تھا مگر وہ یونہی آ گیا تھا ان سب کے ساتھ اور اب اس کو لگتا تھا وہ آجکل بہت سے کام یونہی بے وجہ کرنے لگا ہے۔ کیوں؟ اس سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا یا تھا اور وہ اس سے نظریں چرا رہا تھا۔ ہاتھی کے سفید دانتوں سا انمول پتھر کا مقبرہ سورج کی کھٹی روشنی میں دمکتا تھا۔ سارے ساتھی پھول کی پتیوں کی طرح احاطے میں بکھر گئے تھے ادھر ادھر گھوم رہے تھے، قہقہے لگا رہے تھے، باتوں میں مشغول۔ اس نے وہاں آئے کچھ جوڑوں کی آنکھوں میں لو دیتے عہد و پیمان کی حدت کو عجیب طریقے سے محسوس کیا۔

"کیا یہ سب یہاں ایک دوسرے سے کیے گئے عہد و پیماں نبھا پاتے ہوں گے؟" سوچتے ہوئے بے اختیار اس نے تاج محل کے وسیع احاطے میں کنزہ وسیم کو ڈھونڈنے کے لیے نگاہ دوڑائی وہ اسے کہیں نظر نہیں آئی۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ چار باغ کی جانب نکل آیا یکدم نگاہ اس پر پڑی تھی وہ فوٹو گرافی میں مشغول تھی۔ وہ جانے کتنی دیر یونہی کھڑا رہا وہ تاج محل کی مختلف زاویوں سے تصویریں بناتی رہی پھر وہاں آئے لوگوں سے باتیں کرنے لگی۔ ساتھ ساتھ ان کی تصویریں بھی لے رہی تھی۔ وہ قریب کھڑا خاصی دلچسپی سے اس کے سوالات اور لوگوں کے جوابات سنتا رہا اسی دوران اسے احساس ہوا کہ وہ اس سے ایک بار بھی مخاطب نہیں ہوئی تھی نہ ہی اس کی طرف دیکھا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ گزشتہ ہفتے ہونے والی بحث کی وجہ سے وہ اسے نظرانداز کر رہی ہے۔ پچھلے کچھ دنوں سے آکاش کے ساتھ اس کا انداز لیے دیے رہنے والا ہو گیا تھا۔ اس دن لنچ بریک میں پتا نہیں کیسے کشمیر کا موضوع زیرِ بحث آ گیا تھا۔ کلاس میں اس وقت چند لوگ ہی موجود تھے۔

"آج کل کون سوچتا ہے اپنے مفاد سے آگے تو پھر بھارت اپنے مفاد کے بارے میں کیوں نہ سوچے۔" اس نے جذباتی لہجے میں کنزہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"اور ہم اپنے بھائیوں کو کیوں مشکل میں تنہا چھوڑ دیں۔" جواب اتنے ہی جذباتی لہجے میں آیا تھا۔

"تنہا تو چھوڑا ہے جب تین دفعہ شکست تسلیم کی۔" اس کے جواب پر کنزہ کا چہرہ سرخ ہوا تھا۔

"ہمارا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں جنہوں نے کاغذوں پر شکست تسلیم کرلی اور نہ ہم اس کو مانتے ہیں۔" وہ پر اعتماد لہجے میں تحمل سے بولی۔

"ہر دفعہ صرف کاغذوں پر شکست نہیں ہوئی اور آپ کے ماننے یا نہ ماننے سے حقیقت نہیں بدل جائے گی۔" آکاش نے پورے طور پر اپنے دوست کی سخت نگاہوں کو نظر انداز کیا۔

"اور جو کشمیر میں ظلم اور بربریت کا بازار گرم ہے اسکا کیا؟ کس نے حق دیا ہے لوگوں پر زبردستی حکمرانی کرنے کا؟ پاکستان ان کو زبردستی ساتھ نہیں ملانا چاہتا ہم بس یہ چاہتے ہیں ان کو آزاد چھوڑ دیا جائے، ان کو اپنی مرضی سے فیصلہ کرنے دیا جائے پھر چاہے وہ بھارت کے ساتھ ملنے کا فیصلہ کریں یا پاکستان کے ساتھ یا تنہا رہنا چاہیں۔" اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا یا ماحول کی گرمی اور بڑھتی سب نے مل کر بات کو رفع دفع کروا دیا تھا لیکن وہ اندر کہیں جانتا تھا کہ وہ اپنے موقف میں درست تھی۔

"غالباً آپ مجھ سے کشمیر والی بات پر ناراض ہیں۔ وہ اسے کیمرہ سمیٹتا دیکھ کر بولا۔" جواب میں اس نے بغیر بولے نفی میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ آکاش کو بے اختیار ،بے وجہ ہنسی آئی تھی۔

"فوٹو گرافی کا کافی شوق ہے آپ کو۔" وہ بات کرنے کے غرض سے بولا۔

"نہیں تو میں تو بس یہاں کے یادگار لمحے قید کرنا چاہتی تھی۔"

"لوگ کیسے لگے یہاں کے؟" سوال پھر آیا۔

"ایک جیسے ہیں دونوں طرف، حکومتوں سے خاصے مختلف۔"

"ہنہ۔۔۔" اس نے اسکے تجزیئے کو سراہنے والے انداز میں سر ہلایا۔

"میں آپ سے ایک بات کلییر کرنا چاہتا تھا۔"

"کیا؟" وہ اب چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی وہاں بہتے پانی کے ساتھ ساتھ سرخ پتھر کی روش پر چل رہی تھی۔

"یہی کہ اس دن جو کچھ میں نے کہا اپنے ملک سے محبت میں کہا اور اس محبت میں تو ہر کوئی مبتلا ہوتا ہے ورنہ مجھے اسلام یا مسلمانوں سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔" کنزہ نے بے اختیار مڑ کر دیکھا۔

"In fact (درحقیقت) میں کسی مذہب، کسی خدا پر یقین نہیں رکھتا۔

"لادین ہیں آپ۔"

وہ اس کے فوراً اصطلاح پیش کرنے پر مسکرایا۔

"بالکل!"

"ہمارے کلمے کے پہلے لفظ پر اٹکے ہیں آپ۔"

"اور ہمیشہ اٹکا رہوں گا۔" اس نے جواب دیا تھا۔

"تمہیں یہ سن کر شاید حیرانی ہو میرے بابا کا تعلق ایک مسلمان گھرانے سے ہے اور میری ممی کا ہندو گھرانے سے۔"

"تبھی تو یہ حال ہے آپکا۔" کنزہ نے دل میں سوچا۔

درمیان میں خاموشی کا وقفہ آیا تھا۔

"مجھے کبھی سمجھ میں نہیں آیا کہ محض مذہب کو بنیاد بنا کر انسان کیسے خون کی ندیاں بہا دیتا ہے۔۔۔ آخر کیسے وہ وحشی جانور سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔" کنزہ نے جواب میں گہری سانس بھری اس بات کا جواب تو اس کے پاس بھی نہیں تھا۔

"میں نے قدرت اور انسان پر جتنا غور کیا ہے اتنا ہی میرا یقین پختہ ہوا ہے کہ یہ کائنات، یہ دنیا محض ایک حادثہ ہے زندہ جلتے لوگ، فٹ پاتھوں پر ننگے بدن سوئے بچے، چھوٹی، چھوٹی عمر میں بکتی لڑکیاں، زلزلے اور سیلاب سے بے گھر تڑپتے ہوئے لوگ کیا یہ اس بات کو ثابت نہیں کرتے کہ اگر وہ ہوتا تو یہ سب نہ ہونے دیتا۔ کروڑوں لوگ روز ہاتھ پھیلا کر اس سے مانگتے ہیں، ہزاروں مخلص عبادت گزار ہیں جنھوں نے خود کو صرف اس کے لیے وقف کر رکھا ہے مگر سب کچھ بے سود جاتا ہے۔" وہ بولتا چلا گیا تھا۔

"پرانے وقتوں میں بھی لوگ اپنے نبیوں سے یونہی کہا کرتے تھے۔

"کیا کہا کرتے تھے؟"

"کہ آپ کے ہوتے ہوئے ہم پر یہ مصیبت کیسے آ گئی۔۔۔" وہ تھوڑی دیر تھمی تھی۔

"جنت تو جنت میں ہی ملے گی مسٹر آکاش۔۔۔ دنیا میں نہیں مل سکتی اور پھر اس دنیا میں ہوتے مظالم کا زمہ دار خدا تو نہیں بلکہ ہم خود ہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا تھی۔ ہر ملک کا ادب، اس کے ادوار، نئے پرانے شاعر، مصنف، مصوّر سب اسے ازبر تھے۔ ارنسٹ ہیمنگوے، لوئس ایل ایمر، جارج ایلیٹ، سلویا پلیتھ، ایف سکاٹ، فودور دوتوفسکی، ٹالسٹائی، البرٹ کیمس، مارکس زسیک، جون گرین، ٹیگور، شیو کمار بٹالوی منشی پریم چند، عبدالحلیم شرر، مرزا ادیب، قراۃالعین حیدر، غالب، میر، حالی، فیض، ممتاز مفتی، بانو قدسیہ، قدرت اللہ شہاب، بلھے شاہ، شاہ عبدلطیف بھٹائی یہ سب اس کے پسندیدہ تھے اور ان کی لکھی باتیں ہر وقت اس کے لبوں پر ہوتیں۔ وہ بولنے پر آتی تو بولتی چلی جاتی، سننے پر آتی تو سنتی چلی جاتی۔

پچھلے دس دنوں میں جب سے کلاس کے مختلف گروپز بنا کر پروفیسر نے ہر گروپ کو آرٹیکل لکھنے کے لیے الگ الگ ٹاپک دیا

تھا اس نے اس کے ساتھ دہلی کا کونہ کونہ کنگھال ڈالا تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ بعض معاملات میں اس سے شدید اختلاف ہونے کے باوجود اس کے ساتھ پھرتے وہ ذرا بیزار نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کے ساتھ زندگی کو ایک نئے زاویے سے دیکھ رہا تھا۔۔۔ اسکے زاویے سے۔ وہ اس کے ساتھ ہوتا تھا تو اسے سب کچھ اچھا لگتا تھا اسکی شخصیت میں کوئی ایسا چارج تھا جو اسے اپنی اوڑھ کھینچتا تھا ۔اس کی بہت سی حرکتیں عجیب تھیں مگر پھر بھی آکاش کو اس سے انسیت محسوس ہوتی تھی۔

سچ تو یہ ہے میں نے آج تک اس قسم کا عجوبہ نہیں دیکھا۔ اس نے اسکو جھگی میں ایک سکھ عورت کے پاس زمین پر بیٹھا دیکھ کر خود سے اعتراف کیا۔ اسکا دل چاہا اس منظر کو کیمرے میں قید کرلے مگر اسی وقت اس نے اس کو ہاتھ ہلا کر بلایا اور اس کا کیمرے تک جاتا ہاتھ رک گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

سال پلک جھپکنے میں گزرا تھا۔ یہ سال آکاش کی زندگی میں گزرے ہر سال سے زیادہ خوبصورت اور یادگار تھا جس کا ہر ہر لمحہ اس نے جیا تھا۔ اس سال اس نے کئی مشہور انٹرویوز بھی کیے جو بہت مقبول ہوئے تھے، اسے بھارت کی مشہور سیاسی شخصیات سے ملنے کا موقع ملا تھا۔ یونیورسٹی میں تقریباً ہر کوئی اس سے متاثر تھا سوائے کنزہ کے۔

اس نے ٹی وی لاؤنج کی کھڑکی سے باہر نظر ڈالی۔ اسکا بڑا بھائی روہت اپنے دوستوں میں گھرا کسی بات پر قہقہہ لگا رہا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں وہ سکون اور خوشی محسوس کر سکتا تھا جس خوشی کا وہ ہمیشہ متلاشی رہا تھا۔ روہت ہمیشہ سے ایسا ہی تھا ہر لمحے سے خوشی کشید کرنے والا، وہ کسی بھی چیز کو کبھی دل سے نہیں لگاتا تھا اور آکاش کبھی ایسا نہیں کر سکا اسے ایسے لگتا تھا وہ آج بھی اپنی ماں کے جلتے وجود کی تپش میں زندگی گزار رہا ہو۔ شروع سے ہی روہت کے دوستوں کا حلقہ بے حد وسیع تھا آکاش کو نہیں یاد پڑتا وہ کسی جگہ گیا ہو اور وہاں اسے روہت کا کوئی دوست نہ ملا ہو۔ چاہے وہ کسی ڈاکٹر کا کلینک ہو،، بینک ہو یا پوسٹ آفس وہ جہاں جاتا وہاں اس اسکا کوئی واقف کار ضرور مل جاتا تھا۔ اور وہ خود اس معاملے میں تقریباً تہی دامن تھا۔ بابا اسکے بارے میں ہمیشہ فکر مند رہے تھے۔ ان کو اس کی گوشہ نشینی کی عادت بالکل پسند نہیں تھی گو وہ پڑھائی میں ہمیشہ روہت سے آگے رہا تھا مگر پھر بھی اسے ایسا لگتا تھا کہ وہ بابا کا فیورٹ نہیں ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ کافی سنبھل گیا تھا۔ لوگوں سے ملنے جلنے لگا تھا مگر پھر بھی روہت اور اس کی زندگی میں موجود فرق صاف نظر آتا تھا۔ آج روہت کی سالگرہ تھی ہمیشہ کی طرح آدھا شہر مدعو تھا۔ بابا کیک کٹنے کے بعد اوپر اپنے کمرے میں چلے گئے تھے اور وہ یہاں باورچی خانے سے ڈرنکس لینے آیا تھا اور کتنی ہی دیر وہ کھڑکی سے باہر اس کو دیکھتا رہا۔

ڈرنکس ہاتھوں میں پکڑے باورچی خانے سے باہر نکلتے ہوئے یونہی سامنے والی دیوار پر نظر پڑی اسے یاد آیا یہاں کبھی ماما نے کرشن کی مورتی رکھوائی تھی۔ مذہب کے معاملے میں اس کے ماں باپ دونوں ایک طرح تھے بس تہواروں تک محدود۔ مگر

جب اس کی ماں کو کینسر تشخیص ہوا تو وہ مذہب کی طرف مائل ہو گئی تھیں۔ اس نے اکثر انہیں اس مورتی کے آگے گڑگڑاتے دیکھا تھا۔ وہ اسی طرح طرح خالی خالی کیفیت میں کچھ دیر دیوار کو تکتا رہا۔ باہر آیا تو روہت ابھی بھی خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ کچھ دوست موسیقی پر رقص کر رہے تھے وہ ڈرنکس میز پر رکھ کر یونہی چلتا گھر سے باہر نکل آیا گھر سے باہر تاریکی اور سناٹا تھا۔ وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے چلتا چلا گیا۔ کچھ دور تک گھر سے اٹھنے والے قہقہوں اور موسیقی کی آواز اسکے ساتھ چلی آئی پھر وہ بھی بند ہو گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ یکدم چونکا دہلی سے کراچی جانے والی پرواز کا اعلان ہو رہا تھا۔ اگلے لمحے وہ خود کو سنبھالتا اٹھا اور مضحل قدموں سے چلتا اندر کی طرف چلا گیا۔

دوسرا سال بھی اسے ایسے لگا جیسے ہوا کے جھونکے کی طرح گزرا ہو۔ ڈھیر ساری یادوں، مسکراہٹوں سے بھرا۔

ایم اے کا فائینل سمیسٹر آن پہنچا تھا۔ ان دنوں سب طلبا چھٹی کے بعد گروپ سٹڈی کر رہے تھے۔

"کیا واقعی ان امتحانات کے بعد تم پاکستان چلی جاؤ گی؟" آکاش جو کہ کتاب میں سر دیے کسی ٹاپک میں الجھا ہوا تھا انورادھا کے سوال پر چونکا وہ کنزہ سے پوچھ رہی تھی۔ اس بات کا خیال تو اسے ان دو سالوں کے دوران کبھی آیا ہی نہیں کہ ایک دن وہ یہاں سے چلی جائے گی۔

"ہنہ Hopefully (امید ہے)، کچھ عرصے میں وہاں Election (انتخابات) ہیں۔۔۔ میرے بڑے بھائی حصّہ لے رہے ہیں، اس لیے تب تک تو میں اور ماما چلے ہی جائیں گے۔" وہ بال پوائنٹ ہونٹوں میں دبائے کہہ رہی تھی وہ یکدم بے چین ہو اٹھا۔

امتحانات کے شروع ہوتے ہی سب بری طرح مصروف ہو گئے تھے سب کا ہر طرف سے دھیان ہٹ گیا تھا۔ صبح شام روبوٹ کی طرح ایک جگہ بیٹھ کے پڑھتے گزرتے چلے گئے۔ اس دن آخری پیپر تھا آکاش نے ممتحن کو حل شدہ پیپر پکڑا کر سکھ بھرا سانس لیا اور کلاس روم سے باہر نکلا۔

"ہم نے تو سوچا تھا اسکے لیے زبردست سی فیئرویل پارٹی رکھیں گے مگر وہ تو کل ہی جا رہی ہے۔" اس نے انورادھا کو کہتے سنا۔

"کون جا رہی ہے؟" وہ پیچھے سے آیا تھا۔

"کنزہ اور کون۔۔۔" سوناکشی چپس منہ میں رکھتے ہوئے بولی۔

"کل۔۔۔ کہاں ہے وہ۔"

"ایڈمنسٹریشن ڈیپارٹمنٹ گئی ہے۔بے مروت تو دیکھو کان و کان خبر نہیں ہونے دی اس نے کہ ختم ہوتے ہی اگلے دن چلی جائے گی۔"انورادھا آکاش کو جواب دیکر اب اسکی بے مروّتی کا رونا رو رہی تھی۔

تقریباً بھاگتا ہوا وہ ایڈمنسٹریشن ڈیپارٹمنٹ پہنچا تھا۔وہ اسے وہاں سے باہر نکلتے نظر آئی۔

"تم کل واپس جا رہی ہو۔۔۔پاکستان؟"اس کے پاس پہنچ کر پھولی ہوئی سانسوں سے بولا،لہجہ ایسا تھا جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو۔ہاں وہ مختصر جواب دے کر باہر کے گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

"مگر کیوں؟ابھی تو تمہارے بابا یہیں ہیں نا۔۔۔"

"ہاں میں اور ماما پہلے جا رہے ہیں۔۔۔میں نے بتایا تھا نا بھائی کے بارے میں وہ واپس آ رہے ہیں انگلینڈ سے تو۔۔۔ماما اس لیے پہلے جانا چاہتی ہیں"وہ رک رک کر بولی تھی۔

"بابا بھی ایک دو مہینوں تک آ جائیں گے ان کی مدت بھی ختم ہو رہی ہے یہاں۔

"کچھ دن اور رک جاؤ۔"وہ یکدم چلتے ہوئے اس کے سامنے آ گیا تھا۔

"کم از کم جب تک تمہارے بابا یہاں ہیں۔"اس کا بس نہیں چل رہا تھا اس کو زبردستی روک لے۔

"نہیں میں نہیں رک سکتی۔اس نے سامنے سے آتی کلاس فیلوز کی معنی خیز نظروں کو محسوس کرتے ہوئے سختی اور ناگواری سے کہا۔وہ اسکے اس طرح سختی سے بولنے پر کچھ پلوں کے لیے چپ ہو گیا۔

"اپنا فون نمبر مجھے بھیج دو گی وہاں سے۔"اب کی بار لہجہ مدھم تھا۔

"ہاں کوشش کروں گی۔"وہ اس کے جواب میں چھپا واضح انکار محسوس کر سکتا تھا۔وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی اور آکاش وہیں کھڑا رہ گیا۔

"آخر ہمیشہ وہ ہی کیوں مجھے پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔۔۔میں ہی کیوں روؤں اسکے لیے ہمیشہ۔۔۔ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ میں اسے چھوڑ جاؤں اور وہ روئے۔۔۔ایسا کیوں نہیں ہوا اس وقت وہ میری موت پر رو رہی ہوتی۔"

وہ بورڈنگ کے بعد جہاز میں بمشکل اپنی سیٹ تک پہنچا۔جہاز میں رش ہونے کی وجہ سے بہت شور تھا یا شاید اسے محسوس ہو رہا تھا۔لوگ مطلوبہ سیٹ کی تلاش میں سرگرداں تھے،کچھ سامان اوپر فٹ کرنے کی کوشش میں تھے۔بچوں کے رونے کی آوازیں،لوگوں کا شور وہ تھکا تھکا سا بیٹھا سنتا رہا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

"بابا پلیز کچھ کریں نا۔میں افریقہ وہ بھی دادا اب نہیں جانا چاہتا۔"اس کورپورٹنگ اور فیچرنگ کے لیے کینیا بھیجا جا رہا تھا اور

وہ سخت نالاں تھا۔

"کم آن یار۔۔۔اب کوئی کام تو دل سے کرلو۔" یہ روہت تھا، فٹ بال میچ دیکھنے کے دوران اس نے گردن موڑے بغیر کہا تھا۔

"تم اپنے کام سے کام رکھو میرے معاملات میں ٹانگ مت اڑاؤ۔ وہ چڑ کر بولا۔

"بابا۔۔۔"رفیق احمد نے بمشکل لیپ ٹاپ پر کام کرتے ہوئے نظر ہٹائی۔

"ساری بیٹا میں اس سلسلے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔۔۔اگر واقعی آپ کو ترقی کرنی ہے تو کچھ کام اپنی خواہش کے برعکس بھی کرنے ہوں گے۔"وہ تلملا کر رہ گیا۔ زیادہ غصہ اسے روہت کے دانت نکالنے پر آیا تھا۔

نیروبی ائرپورٹ سے سیدھا اس نے داداب کے لیے گاڑی بک کروائی تھی۔ یہاں سے داداب تک کا سفر تقریباً سات گھنٹے کا تھا۔ شیشہ کھلنے پر گرم ہوا کے جھونکوں سے اسے متلی سی ہونے لگی کلس کر اس نے شیشہ بند کیا اور ایک بار پھر اپنی اخبار کی نوکری پر لعنت بھیجی۔ گاڑی اب داداب کے قریب تھی کہ اس کی نظر صحرا میں دوڑتے زرافوں پر پڑی مگر گاڑی کی تیز رفتاری کے باعث وہ فوراً ہی پیچھے رہ گئے۔

یہ علاقہ صومالیہ اور کینیا کی سرحد سے سو کلو میٹر کے فاصلے پر تھا صومالیہ میں جنگ چھڑنے کے بعد یہاں تین جگہ کیمپز قائم کیے گئے تھے مگر پھر قحط کی وجہ سے یہاں پناہ گزینوں کی آمد میں بے پناہ اضافہ ہوا تھا سو اب پانچ جگہ پر یہ کیمپز قائم تھے۔ یہ دنیا کا وہ سب سے بڑا علاقہ تھا جو پناہ گزینوں کے لیے مختص کیا گیا تھا۔ اسے سیاہ چمڑے کے پنجر چلتے پھرتے دیکھ کر جھرجھری سی آجاتی۔ ایسا نہیں تھا کہ اس نے بھارت میں غربت زدہ علاقے نہیں دیکھے تھے مگر یہاں کی صورتحال ناقابل برداشت تھی۔ آدھے سے زیادہ لوگوں کی پناہ گزین کے طور پر رجسٹریشن نہیں تھی۔ خوراک کا فقدان تھا، پینے کے پانی کی کمی تھی۔ باقاعدہ طور پر نکاس کا کوئی انتظام نہ تھا۔ وہ ان پلاسٹک اور درختوں کی شاخوں سے بنے خیموں میں پھر پھر کر انٹرویو کر رہا تھا، ان افلاس زدہ لوگوں کو کیمرے میں قید کر رہا تھا اور وہ جانتا تھا کہ وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر پائے گا۔

اس دن اس نے UNHCR(پناہ گزینوں کے لئیے اقوام متحدہ ایک ادارہ) کے کارکنان سے انٹرویو کرنا تھا۔ سو وہ ایک فیڈنگ کیمپ میں داخل ہوا۔ ننھے ننھے سیاہ ہاتھوں پر ہاتھوں سے بڑے ڈرپ نوزل پیوست تھے، ان کے سرہانے بیٹھی ماؤں کی آنکھوں میں عجیب سی ویرانی تھی۔ وہ افسردہ سا ان کو دیکھتا آگے آیا۔ اسے وہم سا ہوا کہ وہ وہاں بیٹھی ہے۔ چھوٹے سے لاغر وجود کے منہ میں دلیا ڈال رہی ہے، اس نے وہم جھٹک کر آگے بڑھنا چاہا تو اسے اس کے ہنسنے کی آواز سنائی دی اسے لگا وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ اب وہ اس بچے کے ماتھے کو چومتے اس کی ماں سے کچھ کہہ رہی تھی۔

"کنزہ وسیم اور یہاں میرے سامنے پورے چار سال بعد افریقہ کے اس لق و دق صحرا میں۔۔۔"اس نے خواب میں ہی خود کو کہتے سنا۔

وہ مڑی، اسکی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں شناسائی کے رنگ ابھرے اور پھر اس کے لبوں پر ہنسی کھل اٹھی۔ آکاش کے دل میں ارتعاش پیدا ہوا۔

"یہ وہ آخری چیز بھی نہیں تھی جس کی میں یہاں توقع کر سکتا تھا مگر یہ میری سب سے بڑی خواہش ضرور تھی۔۔۔ کہ کبھی ۔۔۔ کہیں۔۔۔"وہ اب اس سے کہہ رہا تھا۔ وہ اس عورت سے ایکسکیوز (معذرت) کرتے اس کے ساتھ آگے بڑھ آئی۔

"یہاں کیسے؟"وہ خوشگوار سے لہجے میں اس سے پوچھ رہا تھا۔

"یو این ایچ سی آر کے لیے کام کر رہی ہوں آجکل۔"وہ ایک کرسی اس کو پیش کرتے خود دوسری کرسی پر براجمان ہوتے ہوئے بولی۔

"اور آپ؟""میں ایک رپورٹ کے سلسلے میں یہاں آیا ہوں اس نے خیمے میں لائن سے لگے بستروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

اگلے دن وہ کنزہ کا پتا کرتا ہوا سیدھا میڈیکل کیمپ آیا تھا۔ اندر داخل ہوا تو وہ کسی عورت کے سر پر ہوئے زخم صاف کر رہی تھی۔

"یہ کام تم کیوں کر رہی ہو؟ کسی ڈاکٹر کو بلواؤ۔"اسکو کنزہ کی یہ حرکت بالکل پسند نہیں آئی تھی۔

"او کم آن اتنی ناتجربہ کار نہیں ہوں میں۔۔۔ تھوڑی بہت تربیت لی ہوئی ہے میں نے۔"

"تم سمجھ نہیں رہی۔۔۔ کیا تمھیں نہیں معلوم یہاں کس کس قسم کی بیماریاں پھیلتی رہتی ہیں۔۔۔ اتنا بڑا رسک کیسے لے سکتی ہو تم؟"

"کیا ہو گیا ہے آپکو اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔۔۔ یہ بھی میری اور آپکی طرح انسان ہیں۔۔۔ ان کو بھی سہارے اور ہمدردی کی ضرورت ہے۔ یہاں کی ڈیوٹی پہ ڈاکٹر کھانا کھانے گیا ہے تب تک اس کا خون بہتا رہے؟"اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا وہ خاموش ہو گیا۔

"اور اب آپ مجھ سے بھی ذرا احتیاط کیجیے گا ممکن ہے اب تک کوئی وائرس مجھے لگ چکا ہو۔"ہمیشہ کی طرح بگھو بگھو کر اس کی بے عزتی کرتی وہ ہاتھ دھونے کے بعد اب سینیٹائیزر لگا رہی تھی۔

"تم سفیر کی بیٹی، وزیر کی بہن عیش کرو اپنے ملک میں یہاں کہاں خوار ہوتی پھر رہی ہو۔"وہ ڈھٹائی سے مسکرایا تھا۔

"پہلی بات میرے بابا آجکل سفیر نہیں ہیں اور دوسری بات میرے بھائی کافی ہیں اس کرسی پر عیش کرنے کے لیے تو آپ

مجھے یہ کام ہی کر لینے دیں۔"

"پھر کوئی ایک آدھ تصویر فیس بک پر ہی ڈال دو، ووٹ بینک بڑھے گا۔" وہ اب اس کو پھر چھیڑ رہا تھا۔

اگلے دن ڈیوٹی آورز (گھنٹے) ختم ہونے کے بعد وہ انہیں خیموں کے درمیان چہل قدمی کر رہے تھے۔ گرم سی شام تھی، خیموں کے درمیان چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں جہاں گوشت، سبزی مصالحے، چائے اور روزمرہ استعمال ہونے والی اشیاء ملتی تھیں۔

"پچیس سال سے یہ لوگ اس طرح جی رہے ہیں ان لوگوں کی ذلّت اور تکلیف بھری زندگی کا کوئی انت نہیں نظر آتا۔" وہ اداسی سے بولی تھی۔

"یہاں پچھلے دنوں کتنے ہی بچوں نے میرے ہاتھوں میں دم توڑا ہے۔" اس نے اپنے ہاتھ اپنے سامنے پھیلا کر انہیں اداسی سے گھورتے ہوئے کہا۔

"یہاں کی حکومت یہ کیمپز بند کرنا چاہتی ہے کیونکہ یہاں دہشت گردی پنپنے لگی ہے پتا نہیں یہ سب کب تک چلے گا۔" اسکے لہجے میں ان لوگوں کی زندگی کا درد چھپا تھا۔

"یہ دکھ کی کہانی صرف اس علاقے کی تو نہیں ہے، تم جانتی ہو افغانستان، عراق، شام، لیبیا، فلسطین، سوڈان ہر جگہ کیا حشر ہے بڑی طاقتیں صرف اپنے فائدے کے لیے ان سب ممالک کا استحصال کر رہی ہیں۔ انکے معدنی زخائر سے فائدہ اٹھانے کے لیے ان کو حالت جنگ میں رکھا ہوا ہے۔ کسی کو ویسے ہی قابو کر رکھا ہے اور کوئی قدرت کی ستم ظریفیوں سے مجبور ہے۔ امداد کے نام پر پھر چند ادارے بنا دینا کوئی گھاٹے کا سودا تو نہیں۔" وہ کڑوے لہجے میں بولا۔

"آپ بھی تو کشمیر میں یہی کچھ کر رہے ہیں۔" وہ چڑانے والے انداز میں بولی۔

"برائے مہربانی تھوڑی تصیح کر لیں میں نہیں کر رہا ہماری حکومت کر رہی ہے۔"

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ جنگ و جدل، یہ جھگڑے اور فساد ختم ہو جائیں۔۔۔ ہر طرف امن ہو، سکون ہو۔۔۔ ہر کوئی اپنی مرضی سے جیے اپنے عقیدے کے مطابق۔۔۔ اور یہ سارا پیسہ جو جنگوں میں استعمال ہوتا ہے اس طرح کے لوگوں کے لیے استعمال ہو جو قدرت اور قسمت کے ستائے ہوئے ہیں۔"

"اتنی شدید آئیڈلزم کنزہ وسیم۔۔۔ یہ وہ خواب ہے جس کی کوئی تعبیر نہیں ہے۔" اپنے اس جملے سے اس نے اسکے چہرے پر دکھ پھیلتے دیکھا تھا۔

"چلو آؤ وہاں بچوں کے پاس چلتے ہیں۔" کچھ دور میدان میں درخت کے سائے میں چھوٹے چھوٹے بچوں کا ٹولا کھیل رہا

تھا،وہ اسکا دھیان بٹانے کے غرض سے بولا۔

”Sir, would you like chicken or mutton (سر آپ مرغی لینا پسند کریں گے یا گوشت)“ ائر ہاسٹس اس سے پوچھ رہی تھی۔وہ ہڑبڑا سا گیا تھا۔

”Nothing(کچھ بھی نہیں)“ بمشکل خود کو کمپوز کر کے اس نے جواب دیا اور سر سیٹ کی پشت پر ٹکا دیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

”آپ یہ مجسمہ کیوں خرید رہے ہیں؟“آپ تو خدا پر یقین نہیں رکھتے۔۔۔اور یہ آدمی تو خدا کو پکار رہا ہے۔“اگلے دن وہ اسے پتھر کے ایک مجسمے کے لیے دکان دار سے بھاؤ تاؤ کرتے دیکھ کر بولی تھی۔

”وہ کیسے؟“اس نے سوالیہ انداز میں اس سے پوچھا۔

”دیکھیں اس نے ہاتھ اوپر اٹھا رکھے ہیں اور آسمان کی طرف دیکھ رہا ہے۔۔۔جیسے خدا سے فریاد کر رہا ہو۔۔۔“اس نے مجسمے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”تم خدا کو مانتی ہو،اس پر یقین رکھتی ہو اس لیے تمہیں ایسا دکھ رہا ہے۔مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے اس نے خدا کو ڈھونڈنے کے لیے نگاہ اٹھائی ہے اور وہ وہاں موجود نہیں ہے۔“

وہ ایک دو لمحے اسے ایسے ہی دیکھتی رہی۔

”ایسا نہیں ہے۔۔۔“پھر آہستہ سے بولی اور دکان سے باہر نکل گئی۔وہ مجسمہ خرید کر اس کے پیچھے آیا تھا۔ادھر ادھر نگاہ دوڑائی تو سامنے میدان میں اگے اکلوتے درخت کے نیچے مٹی میں بیٹھی نظر آئی جہاں کل وہ اسے کھیلتے ہوئے بچوں کے پاس لے گیا تھا۔درخت کے پتوں کا بے ڈھب سا سایہ اس پر پڑ رہا تھا۔اسکی رنگت پہلے سے کافی سنولا گئی تھی،اس درخت کے نیچے بیٹھی وہ آکاش کو کوئی جوگن لگی تھی جس نے کسی غم میں دنیا تیاگ دی ہو۔اس نے چپکے سے کیمرہ نکالا اور اس منظر کو قید کر لیا پھر اس کی طرف بڑھا۔اس سے کچھ دور مٹی میں ہی بیٹھ گیا۔

I am sorry اگر برا لگا ہے تو۔“وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

”ایسا نہیں ہے میں جانتی ہوں۔“وہ آزردہ سی بولی۔

”وہ ہے آسمانوں میں کہیں اور اس وقت آپ کو اور مجھے دیکھ رہا ہے۔“آکاش نے بھی اسکی طرح نیلے آسمان کی طرف دیکھا۔

”شاید ہو سکتا ہے۔۔۔“وہ اس کا دل مزید نہیں دکھانا چاہتا تھا۔

"میں ان لوگوں کو شاداں و فرحاں دیکھنا چاہتی ہوں، مسکراتے ہوئے۔ جو کچھ یہ حاصل نہیں کر پائے، جو کچھ ان سے چھین لیا گیا کسی روز یہ اس کا نعم البدل پا لیں۔"

"ایسا ہی ہوگا۔" اس نے اسے تسلی دی تھی۔

"تمہارا stay (قیام) کب تک ہے؟" آکاش کو اسکی فکر ہوئی تھی۔ یہاں کے قیام نے یا شاید گزرے سالوں نے اسے زیادہ حساس کر دیا تھا۔

"چند دن ہی رہ گئے ہیں واپسی میں۔" اس نے جواب دیا تھا۔

"کل مجھے یہاں ایک سوڈانی جوڑے کا انٹرویو کرنا ہے۔ وہ دونوں اسی کیمپز میں پیدا ہوئے اور اب شادی کے بعد انکی بچی کا نام بھی انہی کیمپز میں رہائش پزیر پناہ گزینوں میں ہے تم چلو گی میرے ساتھ؟" وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔ کنزہ نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"ان کی شخصیت کیسی ہوتی ہوگی جو جیلوں میں اور مہاجرین کیمپز میں پیدا ہوتے ہیں؟" کنزہ نے اس سے پوچھا تھا جواب میں آکاش نے گہرا سانس لیا چہرے پر اداس سی مسکان کا سایہ لہرایا تھا۔

درخت کی شاخوں سے بنا گھر جس کی چھت یو این ایچ سی آر کی پلاسٹک شیٹ تھی وہ اندر داخل ہوئے فرش کچی مٹی کا تھا۔ وہ دونوں مسلمان تھے لڑکی کی گود میں سیاہ چیپٹے نقش والی ایک پیاری سی بچی تھی۔

"یہاں بے شک زندگی بہت مشکل ہے مگر آپ کو ایک ایسا ساتھی مل جائے جو آپ سے محبت کرتا ہو جسے آپ چاہتے ہوں پھر یہ خود بخود آسان اور خوبصورت ہو جاتی ہے۔" وہ لڑکا اسے انٹرویو میں پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں کہہ رہا تھا۔ آکاش نے بے اختیار مڑ کر پیچھے دیکھا کنزہ کے ہاتھوں میں ننھی منی زرد سی چڑیا تھی۔ یہاں درخت پر شاید کوئی گھونسلہ تھا اس لیے وہاں مٹی کے چھوٹے سے صحن میں ڈھیر ساری مقامی چڑیاں پھدک رہی تھیں۔ وہ پوری طرح وہاں چڑیوں میں محو تھی اور اس پناہ گزین لڑکی سے ان کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ جوگن کو پرندوں سے بھی عشق تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

"آکاش بیٹا آپ نے ایسے کیوں کیا؟" برسوں پہلے کی یاد ذہن میں دہک رہی تھی۔ اس نے کچھ فوٹو شوٹ رات کے وقت کرنا تھا فارغ ہوتے اسے آٹھ بج گئے تھے۔ کام ختم کر کے باہر نکلا تو اسی درخت کے نیچے آ بیٹھا جہاں وہ ناراض ہو کر بیٹھی تھی۔ سگریٹ سلگایا یاد نے پھر دستک دی وہ ماسی کے گھر تھے انہوں نے بہت اصرار سے انہیں بلوایا تھا۔ ماں کی موت کے بعد ان کی زندگی میں جو خلا پیدا ہوا تھا وہ اس کو پر کرنے کی اپنی سی کوشش کرنا چاہتی تھیں شاید۔ اس کا وہاں انکے گھر بالکل بھی دل نہیں لگ رہا تھا روہت

حسب معمول کزنز کے ساتھ مصروف ہو گیا تھا۔وہ جب سے آیا تھا کمرے میں بیٹھا رہتا،ماسی ٹی وی لگا دیتیں تو اس کے سامنے گھنٹوں بیٹھا رہتا نہیں تو لان میں پڑے پنجرے میں قید ان طوطوں کو دیکھتا رہتا تھا۔کتنا شور مچاتے لڑتے تھے۔ایک دن اسے جانے کیا سوجھی اس نے لان میں پڑا طوطوں کا پنجرہ کھول دیا اس میں تقریباً بیس طوطے تھے سب کے سب اڑ گئے تھے اور اب بابا اسے جھڑک رہے تھے۔ماسی بڑے تحمل سے اس سے پوچھ رہی تھیں کہ اس نے ایسا کیوں کیا مگر اس نے کسی کو جواب نہیں دیا تھا۔

اس نے کل اس سوڈانی جوڑے کے انٹرویو کے بعد کنزہ کو بتایا تھا کہ اس نے کیوں وہ پنجرہ کھول دیا تھا۔

"وہ الگ الگ رنگوں کے طوطے تھے ہر وقت ایک دوسرے سے ناراض شور مچائے رکھتے۔میں نے پنجرہ کھولا تو ان سب پر حقیقت کھلی ہو گی کہ زندگی وہ پنجرہ نہیں تھا جس میں قید وہ لڑتے تھے زندگی تو کھلا آسمان تھا جس میں انہیں اڑان بھرنے نہیں دی جا رہی تھی۔۔۔یہ جو مذہب کے نام پر ایک دوسرے کو ذبح کرتے ہیں نا یہ بھی ایسے ہی پنجروں میں قید لوگ ہیں۔"وہ اسکے ساتھ چلتے خاموشی سے اسے سن رہی تھی۔

"مگر ان کو قید ان کے مذاہب نے نہیں ان کی سوچ نے کر رکھا ہے۔"وہ کچھ دیر بعد بولی تھی۔

"مذہب پابندی نہیں لگاتا آزاد کرتا ہے۔اگر ہر شخص سچ مچ اپنے دین کا مطالعہ کر لے وہ کبھی کسی دوسرے انسان کو نقصان پہچانا تو دور کی بات چیونٹی پر بھی پاؤں نہ رکھے۔یہ جنگ و جدل مذہب سے زیادہ معیشت کے لیے ہے۔۔۔ہر کوئی سچ مچ اپنے دین کو اپنا لے تو یہ غربت مٹ جائے دنیا سے،انسان خود سے زیادہ دوسروں پر خرچ کرنے لگے۔"وہ جواب میں خاموش رہا تھا۔

"اور جہاں تک مذہب کی پابندیوں کا اور سزاؤں کا تعلق ہے،انسان جانور نہ بن جائیں اگر مذہب کی پابندیاں ختم ہو جائیں۔"

"مثلاً کیسے؟" آکاش نے سنجیدگی سے سوال کیا تھا۔

"آپ ہی بتائیں اگر مذہب شادی جیسی پاک رسم نہ رکھتا تو کیا آج فیملی سسٹم ہوتا؟انفرادی طور پر بے شک یہ پابندیاں قید لگیں مگر اجتماعی طور پر یہ پابندیاں بڑی نعمت ہیں۔"وہ اسے سمجھانے والے انداز میں بولی تھی۔

اس نے وہاں پھیلی ستاروں کی مدھم روشنی میں سگریٹ کی سلگتی چنگھاری کو دیکھا اسے سہ پہر کی دھوپ میں چمکتی اسکے دوپٹے کی کرن یاد آئی پھر آسمان کی طرف دیکھا۔

"کیا تم اوپر سے دیکھتے ہو مجھے؟"اس نے ستاروں بھرے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے خدا کو مخاطب کیا تھا۔

"اگر ہو تو احساس کیوں نہیں ہوتا۔"

"آپ چاہے اس کو جتنا جھٹلا لیں،اسکے انبیاء کا انکار کریں مگر جب آپ اس دنیا میں امن اور سکون کی بات کرتے ہیں،جب آپ انسان کی خوشی کی بات کرتے ہیں تو آپ وہی اصول دیتے ہیں جو وہ پہلے ہی وہ اپنے انبیاء کے ذریعے اس دنیا میں الہامی کتابوں کی

صورت بھیج چکا ہے آپ کی زبان بھلے انکار کرے مگر دل اقرار کرتا ہے۔" وہ وہاں پھیلی خاموشی میں اس کی آواز سن رہا تھا۔

"آپ کو نہیں لگتا کہ سارے دین آپس میں متصل ہیں۔۔۔ ہر مذہب ایک خدا تک ہی پہنچاتا ہے، تمام انبیاء ایک ہی پیغام دیتے ہیں ایک دوسرے کی تائید کرتے ہیں، ایک سے اصول بتاتے ہیں زندگی گزارنے کے؟ وہ اس سے سوال کر رہی تھی۔

"اور جواب کوئی نبی ہونے کا دعٰوی کرے تو؟" آکاش نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس سے سوال کیا تھا۔

"وہ تو ممکن نہیں، قران اللہ کی آخری کتاب ہے اسکی authenticity (حقانیت) تو سب تسلیم کرتے ہیں۔۔۔ سب مسلم، غیر مسلم مانتے ہیں کہ اس کے ظہور میں آنے سے اب تک اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس کے الہامی ہونے میں بھی کوئی شک نہیں۔ جو اس کو کھول کر تحقیق کرے گا وہ اس سچائی تک ضرور پہنچ جائے گا۔" وہ تفصیل سے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے بولی۔

"اور اس میں لکھا ہے کہ اس آخری نبی کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔۔۔ قیامت تک کے لیے دین کو مکمل کر دیا گیا ہے۔" وہ وہاں بیٹھا کتنی ہی دیر اسے سوچتا رہا تھا۔ بعض معاملات میں اس سے اختلافات ہونے کے باوجود وہ اسے اچھی لگتی تھی۔ جب جانے کے لیے اٹھا تو نظر اپنے اوپر چھائے اکیشیا کے درخت پر پڑی۔

"کوئی ایک مثال جس سے مجھے یقین آئے کہ وہ اوپر موجود ہے۔" اس نے اس سے پوچھا تھا۔

"اس ویرانے میں موجود یہ درخت۔" اس نے اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا تھا۔

وہ اگلے دن یہاں سے واپس جا رہی تھی جبکہ آکاش کو ابھی ایک ہفتہ مزید رکنا تھا۔ دور دور تک پھیلے صحرا میں ڈوبتا سورج، بکریوں کا ریوڑ اور ان کو ہانکتا چرواہا، اس وقت وہاں کھڑے دونوں کا چہرہ ایک دوسرے کی مخالف سمت میں تھا۔ کوئی دور سے اس منظر کو دیکھتا تو اسے اس وقت دونوں کسی پینٹنگ کا حصّہ لگتے۔

"تم شادی کر لو مجھ سے۔" آکاش نے بے سوچے سمجھے اچانک کہا تھا۔ کنزہ کا چہرہ دوسری طرف ہونے کے باعث وہ اسکے تاثرات نہیں دیکھ سکا تھا جبکہ وہ دیکھنا چاہتا تھا۔

Sorry (معذرت) میں ایک ملحد کے ہاتھوں اپنی زندگی برباد نہیں کروا سکتی۔" جواب فورًا آیا۔ آکاش کو لگا جیسے وہ جانتی تھی کہ آج وہ اس سے یہ کہنے والا ہے۔

"یعنی تم ایک مسلمان کے ہاتھوں اپنی زندگی برباد کروا سکتی ہو۔۔۔؟" اس نے جوابی وار کیا تھا۔

"ہاں وہ ڈھٹائی سے بولی۔" ایک زخمی سی مسکراہٹ اسکے چہرے پر پھیل گئی۔

اگلے دن وہ نیروبی چلی گئی وہاں سے اس کی واپسی کی فلائیٹ تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

داداب میں یو این ایچ سی آر نے متعدد سکولز قائم کیے تھے وہ وہاں اساتذہ اور طلبا کے انٹرویو ریکارڈ کرنے کے لیے آیا تھا۔ جس چیز نے اسکے دل پر چوٹ لگائی وہ یہ تھی کہ وہ بھی تمام انسانوں کی طرح انسان تھے، آنکھوں میں ایک اچھی زندگی کے خواب کا بوجھ اٹھائے پھرتے تھے مگر ان کے سامنے خیموں کا لق و دق صحرا، وسائل کا فقدان تھا اور پیٹھ پر ایک ایسی دنیا تھی جس کو انکے خوابوں سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہاں سے لوٹتے ہوئے اسے اس پلاسٹک کی بوتلوں میں اونٹ کا دودھ بیچتی صومالی عورت کی آنکھیں یاد آئیں۔

”میں مرنے سے پہلے اپنے ملک لوٹنا چاہتی ہوں، اپنی زمین اپنے لوگوں کے لیے کام کرنا چاہتی ہوں مگر میں جانتی ہوں میں لوٹ نہیں سکتی۔“ اس نے کہا تھا۔

وہ یہاں کام جلد از جلد نمٹانا چاہتا تھا کنزہ کے جانے کے بعد عجیب سی بے کلی تھی جو اس کے اندر صحرا کی ریت کی طرح چکراتی رہتی تھی حالانکہ وہ فون پر اس سے رابطے میں تھی۔ بغیر آرام کے وقفے کے اس نے اگلے دن IFO II (علاقے کا نام جہاں پناہ گزینوں کے خیمے قائم ہیں) کا وزٹ کیا تھا۔ یہاں اسے حال ہی میں قائم کیے گئے ہسپتال کے بارے میں رپورٹ تیار کرنی تھی۔ وہ ہسپتال IFO II کے آخری کنارے پر تھا وہاں پہنچنے کی غرض سے وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا کیمپ کی گلیوں سے گزر رہا تھا۔ چلتے ہوئے وہ بے اختیار یاد آئی تھی اس کا تصور اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے لگا ابھی وہ اسے مخاطب کرنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک ٹی وی پر چلتی کمنٹری نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا گلی کے ایک کونے میں کافی سارے لڑکے کھڑے فٹ بال دیکھ رہے تھے۔ وہ ان کے پاس چند پلوں کے لیے ٹھہر گیا تھا۔ آنکھوں میں چمک، ہونٹوں پر مسکراہٹ، اپنی پسندیدہ ٹیم کے جیتنے کی خوشی وہ حیران ہوا تھا اتنی مشکل اور ناقابل برداشت زندگی میں بھی وہ کھیل کا لطف اٹھا سکتے تھے، جی سکتے تھے شاید انکے لیے سانس ہی بڑی نعمت تھی۔

ہسپتال میں داخل ہونے سے پہلے اسے ہسپتال سے متصل چھوٹا سا قبرستان نظر آیا وہ وہاں چلا آیا۔ وہاں موجود بے نام و نشان قبروں کو اداسی سے کتنی ہی دیر دیکھتا رہا۔ کون کون سی آنکھیں ہوں گی، ان میں کیا کیا خواب ہوں گے جو یہاں دفن ہو کر مٹی ہو گئیں وہ سوچتا رہا۔ کنزہ کے جانے کے بعد یہ صحرا اب واقعی صحرا لگ رہا تھا۔ وہ پورا ہفتہ اس نے بغیر آرام کام کیا تھا تاکہ جلد لوٹ سکے۔ داداب چھوڑتے ہوئے اس نے دور سے اس درخت کو دیکھا تھا جس کے نیچے کھیلتے بچوں کے قہقہوں نے دور تک اس کا پیچھا کیا تھا۔ بھارت واپس آنے کے بعد وہ اکثر اسے فون کرتا تھا۔ ان دنوں وہ افغان مہاجر کیمپ میں کام کر رہی تھی۔ اس نے ساتھ ساتھ

کچھ ادبی سرگرمیاں بھی شروع کر رکھی تھیں۔وہ وقتاً فوقتاً اس سے مشورہ لیتی رہتی تھی۔

آکاش کسی بچے کے رونے کی تیز آواز سے یکدم چونکا تھا، جلتی آنکھوں سے کھڑکی سے باہر جھانکا، جہاز نیلے آسمان میں تیر رہا تھا زمین سے بہت دور۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

پچھلے ڈیڑھ مہینے سے اس کی آکاش سے بات نہیں ہوئی تھی اور اب جب اس کا نام فون کی سکرین پر جگمگا رہا تھا تو وہ اٹھانا نہیں چاہتی تھی۔چاروناچار سبز رنگ پر انگلی پھیری۔

"تم شادی کر رہی ہو؟" اس کے رسیو کرتے ہی آکاش کی بے چین سی آواز ابھری تھی۔وہ جواب میں کچھ بول نہیں سکی حالانکہ وہ جانتی تھی کہ یہ خبر سن کر اس کا فون آئے گا پھر بھی وہ کچھ بول نہیں سکی۔کتنی دیر دونوں طرف خاموشی چھائی رہی۔

"ہاں۔" بلا آخر بولنا پڑا ہاتھ میں پکڑے موبائل کا بوجھ اٹھانا اسے دشوار لگا تھا۔

"کل میرا نکاح ہے۔" بیڈ کی چادر کے ڈیزائن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ تھک کر بولی تھی۔وہ اسکو کہہ نہیں سکی اسے جلدی ہے، شاپنگ پر جانا ہے کہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

"میں تمہیں خوش رکھوں گا۔۔۔" کافی دیر بعد فون میں اسکی آواز ابھری تھی۔

"میں جانتی ہوں۔"

"پھر؟"

"پلیز آپ مجھے بار بار ایک ہی بات کہہ کر Embarrass (شرمندہ) مت کیا کریں۔" دوسری طرف اس کا چہرہ سرخ ہوا تھا۔

"تو تم نے مجھ سے کہا کیوں نہیں؟" اضطراب پہلے سے زیادہ تھا۔

"کیا؟ آواز رندھ گئی تھی۔" وہ جلد از جلد فون بند کرنا چاہتی تھی۔

"یہی کہ میں کلمہ پڑھ لوں تو تم مجھ سے شادی کر لو گی۔ وہ سائیڈ ٹیبل پر پڑی اسکی تصویر تکتے ہوئے بولا کہ اچانک رابطہ منقطع ہو گیا اس نے موبائل دیوار پر دے مارا۔

اس کے بعد اس نے کتنے ہی فون کیے مگر بے سود کنزہ نے کبھی اس کا فون رسیو نہیں کیا۔ان اذیت بھرے دنوں میں آکاش نے فیصلہ کیا تھا کہ اب اسے آگے بڑھ جانا چاہیے، اس خود ساختہ قید سے خود کو رہائی دے دینی چاہیئے مگر اس کی کوشش اس معاملے میں بار آور نہیں ہو سکی تھی۔کیریئر بنانے میں وہ جتنا آگے نکل گیا تھا ذاتی زندگی میں اتنا ہی پیچھے رہ گیا۔دو بار منگنی ہونے

کے باوجود وہ گھر نہیں بسا سکا تھا یا شاید وہ بسانا ہی نہیں چاہتا تھا۔

پہلی منگنی اس کی بھابھی کی بہن آشا کے ساتھ ہوئی تھی۔اس نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے فائن آرٹس میں ماسٹرز کیا تھا۔بے حد خوبصورت اور سگھڑ سی لڑکی تھی مگر منگنی کے بعد وہ اس سے شدید طور پر بیزار ہوا تھا۔

"تم نے اسے برتھ ڈے وش کیوں نہیں کیا؟ تم اسے ائرپورٹ رسیو کرنے کیوں نہیں گئے ۔۔۔؟اس کی پسند کا رنگ پہن لیتے تو کونسی قیامت آجاتی؟اس کی دوست کے سامنے ایسے کیوں کہہ دیا؟اسے تو سفید گلاب پسند نہیں ہیں وہ کیوں لے گئے؟"اسکی ہر وقت کی ناراضگی اور بھابھی کے شکووں سے وہ تنگ آ گیا تھا۔

"یار لڑکیوں کے دل بہت نازک ہوتے ہیں،ایسی کیا قیامت آگئ اپنی دوستوں کو ہی تو دکھانا چاہ رہی تھی نا تو مل لیتے ۔"روہت اسے سمجھا رہا تھا۔

"اوکم آن یار میں کوئی شو پیس نہیں ہوں جو وہ مجھے ادھر ادھر دکھاتی پھرے گی۔"اور یوں ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی وجہ سے یہ منگنی ختم ہوگئی تھی۔تب سے بھابھی اور اسکے درمیان بھی جیسے دراڑ پڑ گئی تھی ورنہ اس سے پہلے اسکے اچھے بھلے تعلقات تھے،وہ ان سے کترانے لگا تھا۔

دوسری بار اس کی نظر انتخاب سپنا پر جا ٹھہری تھی۔نئ ابھرتی ہوئی ماڈل اور کافی مشہور اینکر ہے۔اس نے روہت کو فون پر بتایا تھا۔روہت کچھ دیر خاموش رہا پھر اسے گڈلک کہہ کر فون رکھ دیا تھا۔منگنی کا فنکشن اس نے خوب دھوم دھام سے کیا تھا اخباروں اور انٹرنیٹ پر اس تقریب کی دھوم کافی عرصہ مچی رہی تھی اسے یقین تھا کہ کنزہ کو بھی علم ہوا ہوگا۔وہ خوش تھا مگر یہ خوشی زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہ سکی منگنی آٹھ ماہ رہی تھی۔روہت کا ہر اندازہ صحیح ثابت ہوا تھا اس نے آکاش کا جی بھر کہ استعمال کیا،اس کی شہرت اور رتبے کو کیش کیا اور پھر الگ ہوگئی مگر روہت کا آخری اندازہ غلط تھا۔الگ وہ نہیں آکاش اس سے ہوا تھا اس کے انکار سے پہلے آکاش نے اسے منہ کے بل گرایا تھا۔

آکاش جلد شادی کرنا چاہتا تھا اس سلسلے میں جب وہ اس کے مبہم جوابوں سے بیزار ہو رہا تھا تو اسکو سپنا کے کسی سیاستدان کے ساتھ معاشقے کی خبر ایک قریبی دوست نے دی تھی۔اس نے اپنے ذرائع سے تصدیق کے بعد اسے شہر کے سب سے مشہور ریستوران میں بلوایا تھا سپنا آنا نہیں چاہتی تھی مگر انکار بھی ابھی ناممکن تھا سو وہ چاروناچار وہاں بیٹھی پچھلے سوا گھنٹے سے اسکا انتظار کر رہی تھی۔اس نے بیزاری سے کوئی پچاسویں دفعہ آکاش کا نمبر ملایا کہ وہ اسے ریستوران میں داخل ہوتا نظر آیا۔یہ شہر کے مہنگے ترین ریستوران میں سے ایک گردانا جاتا تھا یہاں کوئی واقعہ پیش آئے اور اخبار کی زینت نہ بنے ممکن نہیں تھا۔

"میں آج کچھ زیادہ ہی لیٹ ہوگیا۔"آکاش اس کے سامنے والی کرسی پر براجمان ہوتے ہوئے مسکرا کر بولا تھا۔

"واقعی۔۔۔میں تو اب اٹھ کر جا رہی تھی۔" سپنا نے بمشکل اپنی بیزاری چھپائی تھی۔

"دراصل میں نے تمہیں آج ایک خاص مقصد کے لئے بلایا تھا۔" وہ اسی خوش دلی سے اسکے میک اپ سے مزین چہرے کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

"پلیز آکاش تم جانتے ہو شادی کے لئے مجھے تھوڑا۔۔۔"

"اوکم آن میں نے کب کہا میں تم سے شادی کے بارے میں بات کرنے والا ہوں۔" اس نے اسکی بات درمیان میں کاٹی تھی۔

"میں تو۔۔۔" کہتے ہوئے آکاش نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے کھڑا کیا ریستوران میں موجود سب لوگ ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ اس نے خاص آرڈر دیا تھا کہ جب وہ اپنی فیانسی کو ہاتھ تھام کر کھڑا کرے تو ریستوران میں چلتے میوزک بند کر دیے جائیں کیونکہ وہ ان لمحوں کو یادگار بنانا چاہتا ہے۔ اس گہری خاموشی اور لوگوں کی تکتی آنکھوں نے سپنا کو پزل کر دیا تھا۔

اگلے لمحے آکاش نے ٹیبل پہ پڑا مشروب اٹھا کر اس کے منہ پر چھپاکے سے پھینکا وہ کچھ پلوں کے لئے سمجھ نہیں سکی تھی کہ اس کے ساتھ ہوا کیا ہے، حواس بحال ہونے پر اسکا چہرہ لال ٹماٹر کی طرح ہو گیا تھا اس وقت آکاش نے اس کے ہاتھ سے منگنی کی تقریب میں پہنائی وہ قیمتی ہیرے کی انگوٹھی تقریباً کھینچ کر اتاری تھی اور پر سکون سے انداز میں قدم اٹھاتا ریستوران سے نکل گیا ایسے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اپنی انگوٹھی اسے واپس کرنے کی اسے ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ اس کی جیب سے ہی آئی تھی۔

اس واقعے کے بعد یونہی وقت گزرتا چلا گیا تھا، اس نے خود کو اتنا مصروف کر لیا تھا کہ اسکے پاس سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں رہی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

چودہ سال بعد جب ابھی رفیق احمد کی وفات کو مہینہ ہوا تھا ایک دن اسے کنزہ کا فون آیا تھا وہ اس کی آواز سن کر گنگ ہو گیا۔ وہ اس سے اس کے باپ کی تعزیت کر رہی تھی اور وہ بغیر جواب دیے خاموشی سے اسے سن رہا تھا۔ اتنے سالوں بعد اسکی آواز سنی تھی وہ کچھ دیر اسے بس سنتے رہنا چاہتا تھا۔ وہاں کنزہ کو لگا رابطہ منقطع ہو گیا ہے۔

"کیا آپ کو میری آواز آ رہی ہے؟" وہ بولتے بولتے چپ ہوئی تھی۔

"ہاں۔" اس نے بمشکل خود کو بولنے پر آمادہ کیا۔

"آپ اپنا خیال رکھیے گا۔" وہ اسے کہہ رہی تھی آکاش کو لگا وہ فون بند کر دے گی۔

"اور شوہر کیسے ہیں تمہارے؟" اس نے جلدی سے پوچھا تھا

"الحمدللہ۔ وہ تھوڑا جھجھک کر بولی۔

"کتنے بچے ہیں؟"

"دو بیٹے۔"

"نام کیا ہیں؟"

"حمزہ اور عمر۔"

"آپکے بھائی کہاں ہیں؟" وہ اسے ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب لگا تھا۔

"وہ تو اس وقت لندن میں ہے۔" کنزہ نے اگرچہ آکاش سے بات کرنا چھوڑدی تھی مگر اس کا فون نمبر اور گھر کا ایڈریس وہ انٹرنیٹ سے چیک کر کے اپنے پاس محفوظ رکھتی تھی۔ اس کی زندگی میں رونما ہوتے واقعات، منگنیوں اور افیئرز سے متعلق نیوز، اس کی کتابیں اور فیچرز، اس کے لائیو پروگرامز ہر ایک چیز سے وہ واقف تھی۔

"اور میں نے تمہاری این جی او کے بارے میں سنا ہے۔۔" وہ واپس بات کو اس کی طرف لے آیا۔

"جی۔"

"اقلیتوں کے حقوق کے لیے کام کر رہی ہو؟"

"ہاں۔" جواب مختصر آیا تھا۔ بے خبر تو وہ بھی نہیں تھا۔

"تمہارے بیان اکثر خطرناک ہوتے ہیں۔"

"ہاں وہ تو ہے پر کسی کو تو یہ کام کرنا ہے نا۔ یہ سوچ کر سب منہ بند کر لیں گے تو پھر آواز کون اٹھائے گا۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا وہ ابتک نہیں بدلی تھی۔

اس کے ایک مہینے بعد اقلیتوں کے تحفظ کے حق میں دیے گئے اس کے بیان پر آکاش نے اس کو فون کیا تھا۔

"کیوں بلاوجہ اپنی زندگی خطرے میں ڈال رہی ہو؟"

"آپ کو نہیں پتہ ان کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ میرا مذہب ہرگز اس چیز کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی انسان کو زندہ جلا دیا جائے۔ میرا دین صرف محبت کا درس دیتا ہے محبت سے تبلیغ کی جاسکتی ہے جبر سے نہیں۔"

"تم جانتی ہو ہمارے ہاں لوگ کس قدر جذباتی ہیں، وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچاسکتے ہیں کوئی تمہاری بات کی تہہ تک نہیں پہنچ پائے گا۔"

"مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں پیچھے ہٹ جاؤں۔"

وہ ائرپورٹ سے سیدھا اس کے گھر پہنچا تھا۔لان میں کرسیوں پر تعزیت میں آئے لوگ بیٹھے تھے جنازہ اندر کہیں تھا۔وہ ایک آخری بار اسے دیکھنا چاہتا تھا مگر جانتا تھا کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔اس کے شوہر سے افسوس کر کے وہ کتنی ہی دیر وہیں بت بنا کھڑا رہا۔

وہ آپکا اکثر ذکر کرتی تھی۔اسکا شوہر اسے بتا رہا تھا۔اس نے برآمدے میں ایک بارہ، تیرہ سال کے بچّے کو روتے دیکھا وہ آنکھیں بند کر کے کہہ سکتا تھا وہ اسکا بیٹا تھا۔اس کی ٹانگیں کھڑے کھڑے شل ہو رہی تھیں مگر وہ کرسی پر بیٹھ نہیں پا رہا تھا اسی دوران اسکی طرف ایک قدرے فربہ عورت سرخ آنکھیں لئے بڑھی تھی،وہ کافی دیر سے خود پر اس کی نظریں محسوس کر رہا تھا ۔اس نے قریب آکر آنکھیں چنی کر کے اس کا ایک بار پھر جائزہ لیا اور ذرا جھجھکتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"کیا آپ مسٹر آکاش ہیں؟"اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اوہ!" اسے شاید حیرت ہوئی تھی یا تجسس وہ اندازہ نہیں کر پایا۔

"میں میڈم کی سیکرٹری رہی ہوں ، میرا نام فرح ہے۔کافی سال ان کے ساتھ کام کیا ہے۔"اس نے ناک کی پھننگ کو ٹشو سے پونچھتے ہوئے اس سے کہا۔

" وہ آپ کی تحریروں کی بے حد گرویدہ تھیں۔خاص انڈیا سے منگوایا کرتی تھیں آپکی کتابیں۔"پانی پھر اسکی چشمے سے جھانکتی موٹی موٹی آنکھوں میں بھرنے لگا تھا۔

"ان کی لائبریری میں سب کتابیں موجود ہیں آپ کی۔"

"کیا میں انکی لائبریری دیکھ سکتا ہوں؟"اس نے بے چین ہو کر پوچھا تھا۔

"جی میں آپ کو شام تک لے چلوں گی۔"وہ کہہ کر غائب ہو گئی تھی وہ اضطراب سے لرزتا وجود سنبھالتا کرسی پر جا بیٹھا۔

وہ جنازے کے ساتھ چلتا قبرستان آیا تھا۔اسے یقین نہیں آتا تھا کہ کفن میں کنزہ ہو گی سب سے آخر میں آہستہ، آہستہ لرزتے قدم اٹھاتا۔جنازے میں شریک لوگوں میں سے کسی نے بھی منع نہیں کیا تھا جبکہ اسکو اس بات کا خدشہ تھا وہاں پر کافی سارے لوگ ایسے تھے جو اسے بطور صحافی پہچانتے تھے۔

اور پھر وہ دور سے لوگوں کو اس پر مٹی ڈالتا دیکھتا رہا۔اچانک اس میں شدید خواہش بیدار ہوئی تھی کہ انہیں ایسا کرنے سے روکے۔جانے کتنی دیر گزر گئی وہ جامد وہیں کھڑا تھا اسے یقین نہیں آ رہا تھا اس کا وجود مٹی کے نیچے چلا گیا ہے۔ہجوم چھٹنے کے بعد لڑکھڑاتے قدموں سے وہ اس کی قبر تک آیا تھا گورکن نے دیکھا شام ڈھلے تک کوئی قبر پر پھوٹ پھوٹ کر روتا رہا ہے ورنہ دفنانے کے بعد لوگ زیادہ دیر تک نہیں ٹھہرا کرتے تھے مگر جو وہ نہیں دیکھ سکا وہ یہ کہ وہ اس کی قبر کی مٹی اپنی جیبوں میں بھر کے لے گیا

تھا۔

اگلے دن صبح وہ اسی حالت میں قبرستان سے سیدھا اس کی سیکٹری کے ساتھ اسکے آفس آیا تھا۔ فرح اس کی حالت دیکھ کر کچھ پلوں کے لئے گنگ ہو گئی تھی مگر بولی کچھ نہیں۔ آفس میں اس کا کمرہ سادہ اور صاف شفاف سا اسکی اپنی شخصیت کی طرح تھا۔

"ایسا لگتا ہے میڈم ابھی کہیں کسی دروازے سے اندر داخل ہوں گی۔" سیکرٹری گالوں سے اپنے آنسو صاف کرتے اسکو لائبریری دکھاتے ہوئے بولی۔

"اس دن ان کے بیٹے کی سالگرہ تھی اسی لیے آفس سے جلدی نکلی تھیں، کہہ رہی تھیں سالگرہ کی ساری تیاری خود اپنے ہاتھ سے کریں گی۔۔۔ بہت نرم دل اور عمدہ انسان.... ایسے لوگ بار بار کہاں پیدا ہوتے ہیں۔۔۔" وہ شدید صدمے میں بول رہی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر ان ساری کتابوں کو تکتا رہا جنہیں وہ پڑھتی تھی کبھی۔ وہاں ایک شیلف میں اس کی اپنی لکھی کتابیں قطار میں سجی تھیں۔ اس نے ان میں سے ایک کتاب نکال لی۔

"کیا میں یہ لیکر جا سکتا ہوں اپنے ساتھ؟" اس نے اجازت چاہی۔

"جی۔" وہ منع نہیں کر سکی۔

اس نے کتاب پر اسکے ہاتھ کا لمس محسوس کیا۔

اگلے دن شام کو وہ واپس آ گیا تھا۔ اسے ایسا لگا وہ بھول گیا ہو زندگی دوبارہ کیسے شروع کرنی ہے۔ اس نے اپنی لکھی کتاب دوبارہ پڑھ ڈالی تھی۔ کتاب پر جگہ جگہ مختلف چیزوں کو کنزہ نے ہائی لائیٹ کر رکھا تھا کہیں کہیں اسکی لکھی باتوں پر تبصرے لکھے تھے۔ اسے یقین نہیں آیا تھا کہ وہ اس طرح اس کی کتاب، اس کے لکھے لفظ پڑھتی تھی۔

ایک ہفتے بعد جب وہ اندھیرے کمرے میں بیٹھا کافی کا کپ سامنے رکھے اسے گھور رہا تھا گھر کا ملازم ہاتھ میں ایک خط پکڑے نمودار ہوا۔

سر یہ ڈاکیا دے کر گیا ہے۔ وہ ساکت ہوا تھا وہ خط کنزہ کا تھا جب وہ ہسپتال میں داخل تھی ان دنوں لکھا گیا تھا۔ خط پکڑتے ہوئے اس کے ہاتھ لرزنے لگے تھے اس نے دیپک کو کمرے سے جانے کا اشارہ کیا خط کو کتنی دیر گھورنے کے بعد کھولنے کی ہمت کر پایا تھا۔

"ڈاکٹرز کو میرے بچنے کی امید نہیں ہے اور اب ان آخری دنوں میں بار بار میرا دل چاہتا ہے کہ میں آپ سے بات کروں۔ اگر فون کروں گی تو آپ یہاں آجائیں گے فوراً اور یہ میں نہیں چاہتی۔ سوچا میل کروں لیکن پھر دل چاہا خط لکھوں۔ آپ نے کچھ عرصہ پہلے مجھ سے کہا تھا کہ مجھے حق کے لیے آواز اٹھاتے ہوئے احتیاط کرنی چاہیے ورنہ کوئی بڑی قیمت چکانی پڑے گی اور

دیکھیں زندگی سے بڑی قیمت تو نہیں ہوتی مگر مجھے افسوس نہیں ہے کہ اگر میں مار دیا جاؤں تو شہادت، جیل میں ڈالا جاؤں تو خلوت اور وطن بدر کر دیا جاؤں تو سیاحت۔ میرے لیے ہر صورتحال انعام ہے۔

آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر آپ مسلمان ہو جاتے تو میں آپ سے شادی کر لیتی مگر سچ تو یہ ہے میں تب بھی ایسا نہیں کرتی میرے لئے یہ ناممکن تھا اور آپ اس سوال کا جواب اچھی طرح جانتے ہیں کہ کیوں۔ تکلیف اس بات کی ہے کہ میری وجہ سے آپکو اذیت اٹھانی پڑی۔

کیا آپ اس وقت مجھ پر ایک احسان کر سکتے ہیں؟"جملوں کی سیاہی پھیلی ہوئی تھی وہ پڑھتے ہوئے بے چین سا ہوا۔

"میں آپ سے اس جنت میں ملنا چاہتی ہوں جس پر آپ کو یقین نہیں ہے۔"

نیچے اسکے دستخط تھے جنہیں وہ کتنی دیر بیٹھا دیکھتا رہا تھا۔

"میں تم سے جنت میں ملوں گی۔۔۔"کھنکتی ہوئی آواز آئی پھر خاموشی چھا گئی۔ اس نے اندھیرے میں اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ وہ ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا تاکہ رستہ ڈھونڈ سکے مگر اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ آواز دوبارہ ابھری اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا کہ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ کمرہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ کچھ وقت کے لیے اسے سمجھ نہیں آیا وہ کہاں ہے۔ آہستہ آہستہ اسے احساس ہوا کہ وہ ہسپتال کے کسی کمرے میں ہے۔ پسینے میں بھیگے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے کمبل کھینچ کر اتارا۔ شدید کمزوری محسوس ہو رہی تھی اور ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ گلے میں چبھتے کانٹوں کی تکلیف سے بے چین ہو کر اس نے گلاس پکڑنے کے لیے سائیڈ ٹیبل پر ہاتھ مارا، چھناکے کی آواز سے گلاس ٹوٹا تھا۔ فوراً دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا۔ اگلے لمحے کمرہ روشن ہو گیا تھا۔ آکاش نے چندھیائی آنکھوں سے سامنے دیکھا سامنے روہت کھڑا تھا۔ روہت تیزی سے اس کی طرف آیا۔

"تھینک گاڈ تمہیں ہوش آیا ہے۔"

"کیا ہوا تھا مجھے؟"اس نے گلا صاف کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"دیپک پانی لاؤ۔" جلدی اور ڈاکٹر کو بلاؤ۔ روہت نے اسے جواب دینے سے پہلے باہر کرسی پر بیٹھے دیپک کو آواز دی تھی۔

"بیہوش تھے پچھلے تین دن سے تم۔"اس نے حیرانی سے روہت کی طرف دیکھا اور پھر اپنے ہاتھ میں لگی ڈرپ کے نوزل کو۔ وہ تین دن بے ہوش پڑا تھا اور اسے ایسے لگ رہا تھا وہ چند گھنٹے ہی سویا ہو۔

"نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا تمہارا۔" روہت اسے بتا رہا تھا۔

دو دن بعد وہ گھر آ گیا تھا۔ "یار میں ٹھیک ہوں دیپک ہے میرے پاس تمہارے بچے تمہیں مس کر رہے ہوں گے۔" وہ لان میں کرسی پر بیٹھا چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولا۔

"او کم آن یار بھائی ہو تم میرے۔" روہت نے اسکی آنکھوں کے گرد پڑے حلقوں کو دیکھا جو چند دن میں ابھرے تھے۔

"بھلے تمہیں مجھ سے کوئی وابستگی نہ محسوس ہوتی ہو پر مجھے ہوتی ہے۔"

"ایسا نہیں ہے۔" آکاش کی آواز مدھم ہوئی تھی۔

"ساری۔۔ تمہیں برا لگا تو۔۔۔ مجھے تمہاری فکر رہتی ہے۔" روہت نے فوراً معذرت کی تھی۔ آکاش اس کی آنکھوں میں اپنے لیے پریشانی دیکھ سکتا تھا۔

"اگر دیپک مجھے اطلاع نہ دیتا، ساری بات نہ بتاتا تو مجھے کیسے پتا چلتا؟" روہت شکوہ کر رہا تھا۔

"سال سال گزر جاتا ہے تمہاری میری بات نہیں ہوتی تم نے کیوں میرے اور اپنے درمیان اتنی اونچی دیوار حائل کر لی ہے؟ ساری دنیا میری دوست ہے سوائے میرے بھائی کے۔" وہ دل میں دبائے پچھلے تیس پینتیس سال کے شکوے اس سے کر رہا تھا۔

"میں تمہاری ذاتی زندگی میں کوئی دخل اندازی نہیں کرنا چاہتا تھا یار، پہلے بھی میری وجہ سے بھابھی اور تمہارے درمیان کافی کلیشز رہے ہیں۔" اس نے دیکھا روہت کی قلموں میں بھی بالکل اسکی قلموں کی مانند سفیدی جھلک رہی تھی۔

"وہ پرانی بات ہو گئی ہے سب بھول بھال گئے زندگی میں آگے بڑھ گئے مگر تم آج تک وہیں کھڑے ہو۔" آکاش نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اس بات کا۔

پچھلے تین دن اس کے بیہوش وجود کو دیکھتے جس اذیت میں گزرے تھے وہ روہت کسی سے بیان نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

"تمہارے بچے، بھابھی تمہیں بہت مس کر رہے ہیں۔" آکاش نے روہت کے ساتھ بلئیرڈ کلب میں داخل ہوتے ہوئے دہرایا تھا۔

"ہنہ۔۔۔ اتنی فکر ہو رہی ہے تو چلو پھر تم میرے ساتھ چلو کچھ مہینے وہاں رہ کر واپس آ جانا۔"

"میرا کام ہے یہاں پر۔" اس نے نہ جانے کا جواز پیش کیا۔

"جیسے میں نہیں جانتا کہ پچھلے ایک مہینے سے تم گھر میں پڑے ہو۔ روہت نے پے منٹ کرتے ہوئے ترکی بہ ترکی جواب دیا اور اندر قدم بڑھائے۔

"یا ایسا کرو شادی کر لو تم پھر مجھے اطمینان ہو جائے گا۔"

"اس عمر میں میں اب شادی نہیں کر سکتا۔" آکاش سپاٹ لہجے میں کہتا اس کے پیچھے آیا۔

"بہت سے لوگ چالیس سال سے اوپر کی عمر میں۔۔۔"

"کچھ اور بات کرو۔" اس نے چڑ کر اسکی بات کاٹی تھی۔

وہ پورا ہفتہ دونوں بھائیوں نے بچپن کی ہر یاد تازہ کی تھی، بچپن کے دوستوں سے ملاقات، کلب میں پارٹیز۔ آکاش، روہت کے پاس ہونے کے باعث پہلے سے کافی سنبھل گیا تھا۔ روہت کی چھٹیاں ختم ہو رہی تھیں۔

"اگر تم لندن نہیں آنا چاہتے تو کچھ عرصہ کے لیے کام سے بریک لو اور کہیں گھوم پھر آؤ۔ جس سے تمہارا دھیان بٹ جائے۔ امریکہ یا آسٹریلیا۔"

"ہنہ دیکھتا ہوں میں۔" روہت نے جانے سے پہلے اسے گلے سے لگایا تھا اور کتنی دیر لگائے رکھا۔

"جلدی چکر لگاؤ لندن کا۔۔۔ بچے بھی چاچو کو مس کرتے ہیں۔"

"ہاں میں آؤں گا جلد۔" وہ پھیکا سا مسکرایا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

ایک دن یونہی لان میں وہ آسمان کی وسعتوں پہ نظر ٹکائے بیٹھا تھا کہ پھر اسکی بھولی بسری یاد دستک دینے لگی۔

"ہمارے ہاں کشمیر کو جنت کہتے ہیں۔" گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے سہ پہر کی سنہری دھوپ میں بیٹھے اسنے اسے بتایا تھا۔

"ہمارے ہاں بھی۔۔۔" اس نے اسکے دور تک پھیلے سائے پر نظر جمائے جواب دیا تھا۔

"پر جنت میں خونریزی کی ہمت کون کر سکتا ہے۔" وہ لاجواب ہوا تھا۔ اور پھر پتا نہیں کیوں اگلی شام وہ سری نگر میں تھا۔ لندن میں روہت نے اپنا سر تھام لیا تھا یہاں کنزہ کبھی نہیں آئی تھی پر پتا نہیں کیوں وہ اس جگہ کے بارے میں اتنی حساس تھی۔ وہ بلیوارڈ روڈ پر موجود ایک مقامی ہاٹل میں ٹھہرا تھا۔ اس کی کبھی بڑی شدید خواہش رہی تھی وہ کنزہ کو یہاں لیکر آئے۔ کتنے دن اس نے یونہی گزارے تھے وہاں بے مقصد پھرتے، آوارا گردی کرتے۔

"اس عمر میں میں کہاں بھٹک رہا ہوں۔۔۔ میں کیا چاہتا ہوں۔۔۔؟" رات کو وہ ہاٹل کے کمرے کی چھت گھورتے ہوئے سوچتا۔ ایک دبیز خاموشی تھی جو اندر باہر چھائی ہوئی تھی۔ اتوار کی صبح اسکی آنکھ دیر سے کھلی تھی وہ ناشتہ کرنے کے غرض سے نیچے اترا۔ نیچے سڑک بلاک تھی وہاں احتجاج ہو رہا تھا۔ لگ بھگ پچاس کے قریب عورتیں اور مرد تھے انہوں نے ایک نوعمر لڑکے کی تصویر کے بینرز اٹھا رکھے تھے۔ اچانک پولیس والے نمودار ہوئے تھے انہوں نے آنسو گیس کی شیلنگ کر کے ان کو منتشر ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ مسلسل تین دن تک وہ یہ احتجاج دیکھتا رہا۔

"یہ کون لڑکا ہے اور آپ لوگ یہاں کیوں جمع ہیں؟" تیسرے دن اس نے وہاں کھڑے ایک شخص سے بلا آخر پوچھا تھا۔

"یہ میری بہن کا بیٹا ہے صاحب۔ دونوں بہن بھائی جا رہے تھے اسکی بہن کے ساتھ وہاں ڈیوٹی پہ موجود ایک فوجی نے بدتمیزی کی، بات ہاتھا پائی تک پہنچ گئی بس اٹھا کے لے گئے، آج اٹھارہ دن ہو گئے وہ گھر نہیں آیا۔"

آکاش خاموشی سے واپس آ گیا۔

"ممکن ہے اس نے کچھ اور کیا ہو۔" وہ کھڑکی سے نظر آتے پہاڑوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

اگلے روز جب وہ نیچے گیا تو وہاں احتجاج نہیں بین تھا۔ اس تصویر والے لڑکے کی لاش زمین پر رکھی تھی اور چاروں طرف لوگ جمع تھے۔ اس کا چہرہ دیکھ کر اسے کنزہ کا چہرہ یاد آیا پھر بابا کا پھر ماں کا وہ کتنی دیر بھاری دل سے دیکھتا رہا اور پیدل ہی جانے کس طرف نکل گیا چلتے چلتے شام کے سائے پھیلنے لگے تو اس نے واپس مڑنے کا سوچا بھوک بھی لگ رہی تھی اس سے پہلے کے وہ راستہ تلاشتا بارش شروع ہو گئی اس نے چھت کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا وہاں پلاسٹک کے چھتر کے نیچے ایک فقیر بیٹھا تھا وہ جا کر وہیں کھڑا ہو گیا۔

"میرا دل چاہتا ہے میں یہاں بارش ہوتے دیکھوں۔" اس صحرا میں برسوں پہلے کی کہی بات اس کے کانوں میں گونجی۔

"یہاں جب بارش ہوتی ہے تو سیلاب آ جاتا ہے اس لیے تمہارا دل ایسا نہ ہی چاہے تو بہتر ہے۔" آکاش نے اسکا مزاق اڑایا تھا۔ وہ دھیرے سے چھتر چھوڑ کر بارش میں آ کھڑا ہوا تھا۔ کتنی دیر بھیگنے کے بعد اسے اچانک تھکاوٹ سی محسوس ہوئی تھی۔

"ادھر آ جاؤ بیٹا۔" وہاں بیٹھے فقیر نے آواز لگائی تھی وہ سر سے پاؤں تک بھیگا ہوا آ کر وہیں اسکے پاس بیٹھ گیا۔

"یہاں ایک چنار کا درخت ہوتا تھا دو سو سال پرانا۔" وہ فقیر اس سے کہہ رہا تھا یا خود بڑبڑا رہا تھا اسے سمجھ نہیں آیا۔

"وہ بہہ گیا پچھلے سال۔" اس نے اسکے اشارہ کرتے ہاتھ کی طرف تاریکی میں دیکھا اسے کچھ نظر نہیں آیا۔

سگریٹ کی طلب ہونے لگی تھی اس نے سلگانے کا سوچا پھر ارادہ ترک کر کے سگریٹ واپس جیب میں ڈالی تھی۔ اس نے دیکھا اس فقیر کی ٹانگیں نہیں تھیں۔

"یہ کیسے ہوا؟" ذہن میں ابھرتے خیالوں سے پیچھا چھڑانے کی غرض سے پوچھا۔

"بمباری کی تھی ہمارے گاؤں پر فوج نے اسی میں ضائع ہو گئیں۔" وہ وہیں بچھی دری پر لیٹتے ہوئے بولا۔ وہ شاید سونا چاہتا تھا۔ آکاش کتنی دیر یونہی بیٹھا رہا۔

اگلے دن اخبار کے مالک وجے اہوجا کا فون آیا تھا۔

"ہم نے سنا ہے آپ آجکل کشمیر میں ہیں۔"

"جی۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"دو دن بعد ہمارے ایک وزیر جلسہ کر رہے ہیں سرینگر میں، ریلی بھی نکلے گی تو آپ وہاں ضرور شمولیت اختیار کیجیے۔" اس نے بے دلی سے سر ہلایا اوکے۔ اس ریلی کے خلاف حریّت پسندوں کی تنظیم کے لیڈران نے بھی احتجاجی ریلی کا اعلان کر دیا تھا۔ وہ جب جلسے میں شرکت کے لیے روانہ ہوا تو ساری سڑکیں ویران پڑی تھی، احتجاجی ریلی کے سبھی متوقع شرکاء کو جیلوں میں ڈال دیا گیا تھا اور ان کے لیڈرز کو ان کے گھروں میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔ جلسے میں بھی سخت سیکیورٹی کا انتظام تھا وہ سیکیورٹی چیکنگ کلیر کروا کر اندر داخل ہوا وہ سب لوگ جو سرکاری محکموں میں کام کرتے تھے وہ بھی وہاں موجود تھے۔ کئی خواتین نقاب میں بیٹھی تھیں ساتھ بچے بھی موجود تھے وہ ان کے چہروں پر چھائی بیزاری دیکھ رہا تھا، چیختی آنکھوں سے انکی مجبوری کی داستان سن رہا تھا۔ اس جلسے کا سارا وقت اس کے لیے بہت کٹھن تھا۔

روہت کے بار بار کے اصرار کے باوجود اس نے مزید وہاں ایک ہفتہ بڑھا لیا تھا۔ اور اب جب اس نے ذاتی طور پر تحقیق کی تھی تو اسکی روح کانپ گئی تھی۔ وہ وہاں کے بہت سے گاؤں میں گیا تھا اور محلّوں میں جا جا کر اس نے وہاں کے مسلمانوں کے اندرونی حالات جاننے کی کوشش کی تھی۔ سچ تو یہ تھا کہ اخبار یا نیوز چینل پر خبر کو پڑھنا، سننا ایک بات تھی اور خود لوگوں پر قیامت ٹوٹتے دیکھنا دوسری بات۔ اسکو ان خبروں پر پیش کیے گئے تمام جواز ہمیشہ ٹھیک لگے تھے مگر اب وہ جیسے آئینے کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا اچانک۔

اس نے وہاں سے واپس آ کر آرٹیکل لکھا تھا، کیونکہ وہ خود چیف ایڈیٹر تھا اس لیے آرٹیکل کی چھپوائی میں اسے زیادہ مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ آرٹیکل چھپتے ہی اس کے خلاف طوفان اٹھ کھڑا ہوا، سونے پر سہاگہ یہ کہ کسی نیوز چینل کے مدعو کرنے پر وہ چلا گیا اور وہاں لائیو بیٹھ کر اس نے بھارت کی کشمیر میں پالیسی پر سخت تنقید کی تھی۔ انٹرویو دینے کے بعد وہ رات کو دیر سے گھر پہنچا تھا گھر میں پولیس پہلے سے انتظار کر رہی تھی۔ اس کی ضمانت کی ہر کوشش بیکار گئی تھی۔ روہت لندن سے بھاگا آیا تھا مگر ضمانت نہیں ہو سکی۔

"یہ کیا نیا رولا پال لیا ہے تم نے؟" روہت اسے سلاخوں کے اس طرف سے جھڑک رہا تھا۔

"اب تم اس عمر میں مجھے جھڑکتے اچھے لگتے ہو؟" وہ اسکے اس طرح پولیس والوں کے سامنے جھڑکنے پر خاصا محظوظ ہو اتھا۔ اسکے جواب سے روہت کی خفگی اور بڑھ گئی تھی۔

"سندھیا شدید اپ سیٹ ہے تمہاری وجہ سے۔۔۔" وہ اسے کہہ رہا تھا۔ آکاش نے جواب میں گہری سانس لی تھی۔

"مجھے افسوس ہے پر میں نے جو کیا اس میں کچھ غلط نہیں ہے حق ہی کہا ہے حق ہی لکھا ہے۔"

"مجھے یقین ہے تم پر آکاش مگر تم ایک بھارتی ہو کر یہاں رہ کر یہاں کی حکومت اور یہاں کے لوگوں کے خلاف کیسے کھڑے

ہو سکتے ہو۔"

"کسی کو تو کھڑے ہونا پڑے گا، آئینہ دکھانا پڑے گا ورنہ سب کو غلط اور صحیح کی پہچان کیسے ہو گی۔"

"یہ کیا وید، پران میں لکھی باتوں جیسی باتیں کر رہے ہو۔"

"میں نے کبھی وید، پران نہیں پڑھے، میں صرف انسانیت کی بات کر رہا ہوں۔" روہت نے اسکی ہٹ دھرمی پر گہرا سانس لیا تھا۔

"بلکہ تم ایسا کرو مجھے یہ کتابیں لا دو۔" آکاش کو اچانک خیال آیا تھا۔

"کونسی؟"

"بگھود گیتا اور وید وغیرہ۔"

"کیا کرو گے انکا؟"

"پڑھوں گا۔۔۔مجھے پتہ نہیں یہ کتنی دیر یہاں رکھیں گے تو میرا وقت گزر جائے گا۔" روہت کو لگا تھا اس کا ذہنی توازن بالکل بگڑ گیا ہے۔

وہ کل تین مہینے جیل میں رہا تھا۔ اخبار کے مالکان اس سے شدید ناراض تھے۔ آکاش کی وجہ سے ان کے سیاسی تعلقات پر اچھی خاصی ضرب پڑی تھی۔ وہ کوشش کے باوجود اس سے معافی نامہ تحریر نہیں کروا سکے تھے۔

جیل خلوت ہے کنزہ نے اسے کہا تھا اور خلوت میں خدا سب سے نزدیک ہوتا ہے۔ اس نے خدا کو محسوس کرنے کی کوشش کی تھی وہ اسے احساس کی سرحدوں پر تو نہیں پا سکا مگر اس نے روہت کی لائی ساری کتابیں ان تین مہینوں میں پڑھ ڈالی تھیں اور بالآخر دوستوں کی کوشش اور سفارش سے وہ رہا ہو گیا تھا۔

جیل سے آئے اسے ہفتہ گزر گیا تھا، اور ایک ہفتے سے ہی بارش ہو رہی تھی، رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ آکاش نے بک شاپ کی شیلف سے اٹھائی کتابیں کاؤنٹر پر رکھتے باہر برستی بارش پر نظر ڈالی، اتنے میں اسکا فون جلنے بجھنے لگا تھا۔

"سر آپ سے ملنے کوئی لڑکا آیا ہے۔" دوسری طرف دیپک تھا۔

"میں نے کہا بھی ہے کل آنا پر جا ہی نہیں رہا کہتا ہے بہت دور سے آیا ہے، ملے بغیر نہیں جائے گا۔"

"تم اسے ڈرائینگ روم میں بٹھاؤ میں بس واپس ہی آ رہا ہوں۔" آکاش نے اسے کہا تھا۔

"اوکے سر۔"

وہ گیراج میں گاڑی کھڑی کر کے کتابیں ہاتھ میں تھامے اندر داخل ہوا۔

"سر وہ اندر ہے۔"

"تم چائے کا انتظام کرو میں آتا ہوں ابھی۔" آکاش اسے کہتا کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

"جی فرمائیے۔" وہ سر خشک کر کے ڈرائینگ روم میں صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا تھا۔

"سر میرا نام ناصر ہے، میں کشمیر سے آیا ہوں۔" وہ لڑکا اسے تھوڑا نروس لگا تھا۔

"میں وہاں کے ایک اخبار سے منسلک ہوں۔"

"جی۔" آکاش نے دیپک ے چائے کا ٹرے لیکر میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے پچھلے دنوں آپکا آرٹیکل پڑھا تھا اور لائیو شو بھی دیکھا۔ آپ نے حق کا ساتھ دیا، ہمارے لیے آواز اٹھائی اسکے لیے شکریہ۔"

"اس میں شکریہ کی بات نہیں ہے میں نے وہی کہا جو دیکھ کر آیا تھا۔"

"تو ہم امید کرتے ہیں آپ آگے بھی ہماری مدد کریں گے۔" آکاش نے اس بات کا اسے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

"جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا میں وہاں ایک اخبار سے منسلک ہوں اور ہم کتابیں بھی پبلش کرتے ہیں۔ تو ہمارا دل ہے آپ وہاں آکر کچھ عرصہ ہم لوگوں کے ساتھ رہیں۔ ہماری رہنمائی کریں۔"

"مجھے کچھ وقت چاہیے سوچنے کے لیے اس لڑکے کی بات سن کر اس نے کہا تھا۔"

"سر ہم بے صبری سے آپ کے جواب کا انتظار کر رہے ہیں۔" وہ مصافحہ کرتے ہوئے اٹھا تھا۔

باہر بارش ہو رہی ہے کچھ دیر میں چلے جاؤ۔

"نو پرابلم سر میں چلا جاؤں گا۔" اس نے کہتے ہوئے اسے کارڈ پکڑایا۔

"سر آپ مجھ سے اس نمبر پر رابطہ کر سکتے ہیں۔" آکاش نے کارڈ پکڑ لیا۔ ایک نامعلوم سی اداسی اس کے اندر باہر پھیل گئی وہ جب سے کشمیر سے واپس آیا تھا عجیب سے کرب میں مبتلا تھا، جیل میں گزارے دنوں میں اس کرب میں مزید اضافہ ہوا تھا اس کی وجہ شاید ہزاروں سال پرانے قصے سناتیں وہ کتب بھی تھیں جنہیں اس نے پہلی دفعہ پڑھا تھا۔ اس نے دروازہ کھول کر بارش میں نکلتے اس لڑکے کو دیکھا اور پھر کتنی دیر دروازے پر نگاہیں جمائے کھڑا رہا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

اگلے دن وہ ٹائمز آف انڈیا کے ہیڈ کوارٹر آیا تھا۔

"مسٹر آکاش آپ کی واپسی کی ایک ہی صورت ہے کہ آپ ایک معافی نامہ جاری کریں گے اور آئندہ اس طرح کے کسی

بھی بیان یا تحریر سے پرہیز کریں گے۔" وہ خاموشی سے بغیر کوئی جواب دیے اٹھا تھا اور باہر نکل آیا۔اس نے نہ تو کوئی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی تھی اور نہ ہی ان کا ضمیر جگانے کی۔یہ فیصلہ اس نے خود نہیں کیا تھا،اس کے دل نے کروایا تھا۔وہ اگلے دو مہینوں میں سارے کام نمٹا کر سری نگر منتقل ہو گیا تھا۔

"سر یہ سرمد ہیں ہمارے اخبار کے ایڈیٹر۔"ناصر نے آکاش کا تعارف وہاں آئے لڑکوں سے کرواتے ہوئے کہا۔وہ لوگ اس وقت سری نگر،لال چوک میں اخبار کے ہیڈ آفس میں موجود میٹنگ کر رہے تھے۔

"یہ وقاص ہے۔"آکاش نے دیکھاوہ بائیں بازو سے محروم تھا۔

"سر گولیاں لگی تھیں اس میں بازو ضائع ہو گیا۔"اسکے مضبوط لہجے میں کہیں احساس زیاں کا شائبہ نہ تھا۔

"سر صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ یہ شاعر بھی ہیں مگر ان کی محبوبہ فقط انکا وطن ہے۔"سرمد مسکراتے ہوئے اسے بتارہا تھا۔

"یہ ضیاء اور احمد ہیں نیوز کوریج کرتے ہیں اور باقی چھ سات لڑکے اور بھی ہیں۔ان سے آپ کی صبح ملاقات ہو جائے گی۔"

"آپ سب سے مل کر مجھے بے حد خوشی اور فخر محسوس ہوا ہے۔مجھے یقین ہے ہم مل کر یہاں کشمیر کے حقوق کے لیے آواز اٹھائیں گے اور اپنی زمہ داری سے کبھی منہ نہیں موڑیں گے۔"آکاش نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

"بالکل سر۔"سب نے یک زبان ہو کر جواب دیا تھا۔

"یہاں آنے کے بعد گزر چکے سات مہینوں میں اس نے اخبار کو مکمل طور پر سنبھال لیا تھا۔اسی دوران اسکی سرپرستی میں صحافیوں کا یوتھ ونگ تشکیل دیا گیا تھا مختلف سیمینارز اور کانفرنسز منعقد کروائی گئی تھیں۔آکاش کو اس بات کی بھی بے حد خوشی تھی کہ وہ اکیلا نہیں تھا جو یہاں رہ کر کشمیریوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھا رہا تھا بلکہ بھارت سے تعلق رکھنے والے کچھ نہایت معتبر صحافی جن کا تعلق ہندو مذہب سے تھا کشمیریوں کے لیے کام کر رہے تھے۔اسکی وقتاً فوقتاً ان سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ادبی سرگرمیوں کے حوالے سے ایک کلب کا منصوبہ ابھی زیر غور تھا۔ساتھ ساتھ وہ دو مختلف کتابوں پر بھی کام کر رہا تھا جس میں سے ایک کتاب اشاعت کے لیے تیار تھی۔

چھٹی کا دن تھا بہت دن بعد آج اسے تھوڑا سانس لینے کا موقع ملا تھا۔سو وہ دیر سے سو کر اٹھا تھا۔باہر ہلکی ہلکی برفباری صبح سے مسلسل ہو رہی تھی،آتش دان کی حدت بھری نارنجی روشنی میں آکاش نے ناشتہ کرتے ہوئے ٹی وی کھولا۔۔۔عبدلکریم وہیں صفائی میں مشغول تھا ناصر ہی اسے لیکر آیا تھا۔

"سر بڑا اچھا بچہ ہے،آجکل کام کی تلاش میں ہے۔اس سے آپ کو کبھی شکایت نہیں ملے گی،صفائی،دھلائی کھانا پکانا سب

کچھ کرلیتا ہے۔" ناصر نے اسے ایک چودہ، پندرہ سال کے لڑکے سے ملواتے ہوئے کہا تھا۔

"اس کے گھر والے سب مارے جا چکے ہیں۔" یہ بات اس نے آکاش کو بعد میں بتائی تھی۔

"عبدلکریم کیا تمہیں پڑھنے کا شوق ہے؟" آکاش نے بہت دنوں سے دل میں دبا سوال اس سے کیا تھا۔ وہ جو صفائی میں مشغول تھا ہڑبڑا سا گیا۔

"جی سر؟" اس نے سوالیہ نظروں سے اسکی طرف دیکھا۔

"کیا تم پڑھو گے؟" آکاش نے دہرایا۔

"آپ مجھے پڑھائیں گے؟" وہ حیران ہوا تھا۔

"ہاں میں بھی مدد کروں گا مگر تم سکول بھی جاؤ گے۔"

"مگر پھر کام کون کرے گا سر؟"

"سکول سے واپس آکر کرلینا کام اتنا زیادہ ہوتا بھی نہیں ہے۔"

"بہت بہت شکریہ سر۔" اسکی آنکھیں بھیگ گئیں تھیں۔

"پھر جب کچھ بن جاؤ گے تو تم دنیا میں کہیں بھی جا کر اچھی سی زندگی گزار سکتے ہو امن وسکون والی۔"

"نہیں سر میں کبھی اپنا وطن نہیں چھوڑں گا۔"

"کیوں؟" اس نے دلچسپی سے پوچھا تھا۔

"بھارت تو یہاں پر لالا کر بھارتیوں کا بسا رہا ہے ہم اپنا ملک چھوڑ دیں گے تو انکے لیے قبضہ کرنا آسان ہو جائے گا۔ میں ہمیشہ یہاں رہوں گا یہ میرا ملک ہے چاہے اس میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆

"کریم کہاں ہے؟" وہ ایپرن باندھے ناشتہ بنا رہا تھا ناصر کے آنے پر دروازہ کھولا تو وہ حیران ہو کر اس سے پوچھ رہا تھا۔

"اسکو سکول داخل کروا دیا ہے میں نے۔۔۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"پر سر آپکو مشکل۔۔۔"

"نو پرابلم اتنا تو میں کر ہی سکتا ہوں ساری عمر ایسے ہی رہا ہوں۔" اس نے ایک ہاتھ سے ناصر کی سرخ سفید، گول مول سی بیٹی کے گال چھوتے ہوئے کہا۔ وہ لالی پاپ کھا رہی تھی جس کا لال رنگ اسکے ہونٹوں پر دمک رہا تھا۔

"آپ نے شادی نہیں کی سر؟" وہ ایک پل کو خاموش ہوا تھا۔

"کوشش تو کی تھی پر قسمت نے ساتھ نہیں دیا۔" وہ واپس باورچی خانے میں داخل ہوتے ہوئے مزاحیہ انداز میں بولا تھا۔
ناشتے کے دوران وہ کچھ اہم نکات ڈسکس کرتے رہے تھے۔

"آپ کو دوسری کتابوں کے ساتھ مذہبی کتابیں پڑھنے کا بھی شوق ہے بک شیلف میں ادبی، سائنسی کتابوں کے جم غفیر کے ساتھ تقریباً ہر مذہب کی کتاب پڑی تھی وید، بدھ مت، بائبل کے والیمز، قران کی تفاسیر۔" ناصر نے اسکی کتابوں کی کلکشن سے متاثر ہوتے ہوئے کہا تھا۔ وہ جواب میں کچھ بولا نہیں تھا بس مسکرانے پر اکتفا کیا۔

"میں سوچتا ہوں سر کیا اس جدوجہد کا کوئی انت ہے؟ اسکا کوئی ثمر ہم یا ہماری آئندہ نسل دیکھے گی۔۔۔؟" ناصر نے جانے کس خیال کے تحت اس سے پوچھا تھا۔ آکاش نے محسوس کیا تھا اکثر اسکی باتوں میں ناامیدی کی جھلکتی تھی۔

"ہر کوشش کا نتیجہ ضرور ہوتا ہے چاہے وہ دیر سے نکلے ہاں مگر یہ ضروری نہیں کہ ہر محنت اور ہر کوشش کا نتیجہ ہم اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ پائیں۔" آکاش نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا تھا۔

اگلے دن گائے کے گوشت پر پابندی کے خلاف احتجاجی ریلی نکلی تھی وقاص بھی ضیاء اور احمد کے ساتھ کورتیج کے لئیے چلا گیا تھا۔

"سر گولیاں چلادی ہیں وہاں پولیس نے۔" آکاش کو فون پر ناصر کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی تھی۔ وقاص شدید زخمی ہے ضیاء اور احمد کو بھی کافی چوٹیں آئی ہیں۔" وہ سب بھاگتے ہوئے ہسپتال پہنچتے تھے، مگر ان لوگوں کے پہنچنے سے پہلے ہی وقاص دم توڑ گیا تھا۔

"سر قسم لے لیں گولیاں جب میرے بازو میں پیوست ہوئی تھیں تو مجھے جو ذرا بھی تکلیف ہوئی ہو، جو ہمارے ملک کے ساتھ ہو چکا ہے اسکے سامنے یہ تکلیف کچھ بھی نہیں ہے۔ بس اب تو شہادت کا انتظار ہے مجھے۔" اسکا پر اعتماد، باوقار مسکراتا چہرہ اسکی نگاہوں کے سامنے پھرنے لگا تھا۔۔ وہ ہسپتال میں اسکے لاش کے سرہانے کھڑا کتنی دیر اسکا چہرہ اسکی بند آنکھیں تکتا رہا تھا۔

وہ انٹرنیٹ اور میڈیا پر جتنا طوفان برپا کر سکتا تھا اس نے کر دیا تھا۔ جہاں جہاں سے اسکی آواز باہر کی دنیا تک جا سکتی تھی اس نے پہنچائی۔ صاف ستھری رائے شماری کے لیے آواز بلند کی تھی، احتجاج کا اعلان کیا تھا۔ کشمیر کے عوام کو خود اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا حق دیا جائے۔ اور ان ہی دنوں میں وہ اپنی حق گوئی اور بے باکی کی وجہ سے یکدم وہاں کی عوام میں مشہور ہو گیا تھا۔ بہت سے حریت پسند رہنماؤں نے اس سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا مگر اس نے منع کر دیا تھا۔ میں کسی جماعت سے وابسطہ نہیں ہونا چاہتا اس نے ناصر کو کہا تھا۔

روہت اس سے شدید ناراض تھا۔ "کیوں اپنی جان خطرے میں ڈال رہے ہو؟" وہ بے چینی سے اسکو سمجھانے کی کوشش کر

رہا تھا۔

"کسی نہ کسی کو تو آگے بڑھ کر جان پیش کرنا پڑتی ہے ورنہ تو یہ گورکھ دھندہ ایسے ہی چلتا جائے۔"اس کے اس جواب پر روہت نے مزید ناراض ہو کر فون بند کر دیا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

"چلو فاطمہ۔اس نے کشمیری کڑھائی سے مزین گلابی کپڑوں میں ملبوس فاطمہ کو گاڑی میں بٹھایا تھا۔" وہ اپنے ننھے سے ہاتھ سے اسکے ہاتھ کا سہارا لیکر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔چھٹی کا دن تھا لیکن ان کو شام کو آفس آنا پڑا تھا۔ناصر فاطمہ کو بھی ساتھ لے آیا تھا۔اسے ابھی ایک دو کام اور نمٹانے تھے اس لیے اس نے آکاش سے کہا تھا کہ وہ فاطمہ کو گھر چھوڑ دے۔چاند کی روشنی میں سڑک کے کناروں پر جمی برف مدھم مدھم چمک رہی تھی۔وہ گاڑی مناسب رفتار سے چلاتا فاطمہ سے باتیں کر رہا تھا کہ اچانک ارد گرد دو موٹر سائیکل سوار نمودار ہوئے۔اس نے رفتار تھوڑا بڑھا کر گاڑی آگے کر لی،وہ بھی تیز رفتاری سے دوبارہ ساتھ ہو گئے۔اس سے پہلے کے وہ رفتار دوبارہ بڑھاتا یا فون کرتا فضا میں فائر کی آواز گونجی تھی۔وہ فوراً نیچے جھکا گاڑی سڑک سے اتر کر سامنے درخت سے جا ٹکرائی تھی فاطمہ کی چیخ بلند ہو کر اسکے دل میں پیوست ہوئی۔اس کا دماغ کچھ منٹ میں قابو میں آیا۔اس کا سر پھٹ گیا تھا اور وہاں سے رستا خون چہرے پر بہہ رہا تھا۔گولیاں اس کے دائیں بائیں سے نکل گئی تھیں۔وہ دیوانوں کی طرح فاطمہ پر جھکا وہ بیہوش تھی اور جسم سے خون بہہ رہا تھا۔گاڑی چلانے کی ہر کوشش بیکار جا رہی تھی۔اس نے فون ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر وہ شاید باہر کہیں جا پڑا تھا۔وہ مزید وقت ضائع کیے بغیر کراہتے ہوئے بمشکل گاڑی سے باہر نکلا۔ٹانگ پر شدید چوٹ آئی تھی۔کانپتے ہاتھوں سے دوسری طرف کا دروازہ کھول کر بیلٹ سے فاطمہ کو نکالا۔اس کا سانس چل رہا تھا پتا نہیں کہاں گولی لگی تھی سارے کپڑے خون سے سرخ ہوئے جا رہے تھے۔وہ موٹر سائیکل سوار وہاں سے بھاگ چکے تھے۔اس کی آنکھوں میں کرب بھری دھند چھائے جا رہی تھی۔وہ سڑک پر دیوانوں کی طرح فاطمہ کو لیے بھاگنے لگا۔بھاگتے بھاگتے اچانک اس کا توازن بگڑا تھا اس سے پہلے کہ وہ فاطمہ سمیت نیچے گرتا اس نے عجلت میں قریب لگے درخت کی شاخ کو تھاما۔یکدم اسے احساس ہوا تھا انہونا عجیب سا،آگہی کا کوئی در وا ہوا تھا۔کوئی تھا جو اس وقت وہاں اسکے ساتھ موجود تھا اس نے محسوس کیا تھا اسے پھر اسے زور زور سے پکارا تھا۔

ہسپتال پہنچتے ہی اسے دیکھ کر فوراً نرسز ڈاکٹر متحرک ہو گئے تھے۔فاطمہ کو سٹریچر پر ڈال کر آپریشن تھیٹر لے گئے۔اسے کسی چیز کا کوئی ہوش نہیں تھا وہ باہر بیٹھا صرف دعا میں محو تھا۔ڈاکٹر اس کو ٹانکے لگانا چاہتے تھے مگر وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں رہا تھا۔پھر پونے گھنٹے بعد جب اسے فاطمہ کی خطرے سے باہر ہونے کی اطلاع ملی تو وہ وہیں کوریڈور میں فرش پر سجدے میں چلا گیا۔

اگلا پورا ہفتہ وہ گھر میں قید ہو گیا تھا۔زخم گہرے نہیں تھے مگر تکلیف دہ تھے۔پوچھنے آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔

وہ پلستر کی ہوئی ٹانگ پر زور ڈالے بغیر چھڑی کی مدد سے گھر سے باہر نکلا۔گھر میں بیٹھ بیٹھ کر دل اوب رہا تھا۔ماتھے پر تین ٹانکے اور ہاتھ پر پٹی بندھی تھی مگر وہ پھر بھی لڑکھڑاتا ہوا آہستہ آہستہ چلتا گھر سے تھوڑی دور نکل آیا۔ایک جگہ رک کر کھلی فضا میں اس نے گہرے گہرے سانس لیے۔آج کافی دن بعد ہلکی ہلکی سی دھوپ نکلی تھی۔اس نے محسوس کیا کہ اتنی تکلیف کے باوجود عجیب سی سرشاری اور سکون کی کیفیت نے اس کے وجود کا احاطہ کیا ہوا تھا۔دفعتاً اس کی نظر رنگ برنگے پنجروں میں قید ڈھیر سارے بلبل بیچتے ایک آدمی پر پڑی۔وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر لڑکھڑاتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔

"کتنے کے دوگے؟"وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔اس کے رقم بتانے پر اس نے سارے پنجرے خرید لیے وہ آدمی پیسے وصول کر کے شاداں و فرحاں گنگناتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔پنجروں سے گیلی دھات کی کڑوی مہک پرندوں کے پروں کی مخصوص خوشبو کے ساتھ مدغم ہو کر اٹھ رہی تھی۔آکاش نے ایک ایک کر کے سارے پنجروں کے دروازے کھول دیئے۔کچھ دیر بلبل دروازہ کھلنے پر بھی پنجرے میں بیٹھے رہے مگر پھر جیسے انہیں آزادی کا احساس ہوا وہ اسکے سامنے ایک ایک کر کے آسمان کی طرف اڑنے لگے۔چند گھڑیوں میں سارے بلبل سورج کی شہد رنگ روشنی کی طرف پرواز کر گئے تھے۔اس نے روشنی کے ہالے میں ان کو سیاہ سایوں میں تبدیل ہوتے دیکھا۔

"تم نے کبھی روشنی کو چھوا ہے؟"کنزہ کی کھنکتی آواز کہیں گونجی تھی۔

"نہیں۔۔۔روشنی کو بھلا کون چھو سکتا ہے۔"

"میں نے چھو کر دیکھا ہے۔"

"اچھا۔۔۔کیسا لگتا ہے۔"

"کیا؟"

"روشنی کو چھونا اور کیا؟"

"اوہ، اچھا۔فضا میں اسکی ہنسی بکھر گئی۔ایسا لگتا ہے جیسے جنت کے باغ میں اڑتا کوئی جگنو وہاں سے آکر دل کو مس کر جائے۔"

☆☆☆☆☆☆☆☆

ختم شُد

اس ناولٹ پر آپکی قیمتی رائے کا انتظار رہے گا۔۔